اندھا دیوتا

انگلستان کے رنگین نوا شاعر جان کیٹس کے تین رومان پرور افسانے

اندھا دیوتا

مترجمہ

میرزا ادیب بی اے (آنرز)
عبدالرحیم شبلی بی کام
احسان علی شاہ بی۔ اے

اُردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور

بار اوّل   قیمت ۱۲؍

فہرس

جناب ایم۔ ڈی شیخ صاحب
کے نام

محترمی!

ضروری نہیں کہ آپ ان تمام اوراق کا مطالعہ فرمائیں۔ البتہ اُس خلوص کو قبول فرمائیے۔ جس کے ساتھ میں یہ ناچیز کتاب آپ کی نذر کرتا ہوں ؛

نیازکیش

احسان بی اے

(محمد حنیف تاجر کتب مالک اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا)

پیش لفظ

جان کیٹس کے روح نواز منظوم افسانوں کے اس مجموعہ کو اُردو کے باذوق قارئین کے سامنے پیش کرتے وقت مجھے غالباً کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ انگلستان کے اس مایہ ناز شاعر کے ہر ہر لفظ میں موسیقی اور شعریت انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اور اُس کی نظمیں پڑھتے وقت انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ قدسیوں کے دوش پر سوار ہو کر قوسِ قزح کی جھلملیوں سے گذرتا ہؤا زہرہ و ناہید کی رنگین فضاؤں میں تحلیل ہو رہا ہے۔ جب میں کالج میں "منازل سلوک" طے کر رہا تھا۔ تو مجھے اُس کے تین منظوم افسانے خاص طور پر پسند آئے۔ اور میرا جی چاہا۔ کہ اُنہیں اُردو زبان میں منتقل کروں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے میں اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آخر جون ۱۹۳۹ء میں ادب لطیف کے "افسانہ نمبر" کے لئے میں نے ازابیلا کا "جام ریحان" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ جو اہل ذوق نے بیحد پسند کیا۔ خوش قسمتی سے لیمیہ کا ترجمہ میرے عزیز دوست جناب شبلی بی کام کر چکے تھے۔ میں نے اُن کے

سامنے تجویز پیش کی۔ کہ جان کیٹس کی کم سے کم تین منظومات کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ جس کو اُنہوں نے نہایت حوصلہ افزا طریقہ سے پسند کیا۔ چنانچہ دی ایو آف سینٹ ایگنیز کا ترجمہ اپنے دوسرے عزیز دوست جناب میرزا ادیب بی۔ اے سے کرایا۔ اور اب اِن تینوں حسین و جمیل افسانوں کا مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اُمید ہے وہ بھی اِسے پسند کریں گے۔

یہ کتاب جہاں میرے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ہے۔ وہاں مجھے فخر ہے۔ کہ یہ ہم تینوں دوستوں کی رُوحی اور دلی رفاقت پر خلوص و وفا کی ایک مُہر بھی ہے۔ میرزا ادیب اور شبلی بی کام ملک کے ممتاز ترین ادیب تجربہ کار صحافی اور مشاق مترجم ہیں۔ اُن کی رفاقت اور امداد میرے لئے مُوجبِ فخر اور سرمایۂ ابتہاج ہے۔ دراصل یہی دو نام اس مجموعہ کی کامیابی کے ضامن ہیں۔

کتاب کی ظاہری تزئین و ترصیع کے لئے اُردو اکیڈیمی پنجاب لاہور کے بیدار مغز ناظم میاں محمد حنیف صاحب کا بیحد ممنون ہوں۔ اگر اُن کا جذبۂ شوق شاملِ حال نہ ہوتا۔ تو اِس کتاب کا جلد از جلد مطلعِ اشاعت پر

جلوہ گر ہونا قریباً ناممکن تھا۔

جان کیٹس اپنا مافی الضمیر ادا کرتے وقت بعض اوقات نہایت دقّت پسند ہو جاتا ہے۔ اور یونانی تلمیحات کے بکثرت استعمال نے تو اُسے "پُراسرار شاعر" بنا دیا ہے۔ تاہم اُس کی نظموں کا ترجمہ کرنے میں ہم تینوں نے انتہائی کاوش سے کام لیا ہے۔ اور ایک دوسرے کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اِس کے باوجود اگر دقیق بین حضرات پروپرائٹر اُردو اکیڈیمی پنجاب لاہور کے ذریعہ سے مجھے کسی خامی کی طرف توجہ دلائیں۔ تو اگلے ایڈیشن میں اُس کی ضرور اصلاح کر دی جائے گی۔ الغرض ناقدانہ مشوروں کا مَیں ہر وقت خیر مقدم کروں گا۔

لاہور
۱۵ جنوری ۱۹۴۰ء

احسان علی شاہ بی۔ اے

جان کیٹس

انگریزی ادب کے عہدِ رومانیت کا بلند مرتبت شاعر جان کیٹس اکتیس یا اکتیس اکتوبر ۱۷۹۵ء بمقام مورفیلڈ (لندن) پیدا ہوا۔ اس کا باپ پہلے ایک سرائے کے مالک کے یہاں ہوسٹلر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بعدازاں اس نے اپنے مالک کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور خسر کی وفات کے بعد سرائے کا مالک بن گیا۔ اس طرح جان کیٹس کی تعلیم و تربیت کے لئے حالات سازگار ہو گئے۔

آٹھ برس کی عمر میں جان کیٹس کو این فیلڈ کے ایک مقامی مدرسے میں بھیج دیا گیا۔ یہ مدرسہ ریورینڈ کلارک کے زیرِ اہتمام جاری تھا۔ جان کیٹس بظاہر ایسا ذہین معلوم تو نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس کی گفتگو اور نشست و برخاست کے طور طریقے میں کچھ ایسی کشش تھی۔ کہ مہتمم مذکور کے بڑے لڑکے کو اس سے کچھ اُنس سا ہو گیا۔ اور وہ ہر وقت اسے اپنے قریب رکھنے لگا۔

اسکول میں داخل ہوتے وقت کیٹس کا علمی ذوق اتنا بلند نہ تھا۔ لیکن کلارک کی صحبت نے آہستہ آہستہ اسے کتب بینی کی طرف مائل کر لیا۔ اور آخر

نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ کیٹس کو پڑھنے کا جنون سا ہو گیا۔ اسکول کی لائبریری میں تاریخ۔ سفرنامے اور جغرافیہ کی کتابیں موجود تھیں۔ کیٹس نے بہت جلد ان کتابوں کو پڑھ لیا۔

اس اثنا میں اس کا باپ مر گیا۔ اور اس کی ماں نے چند ماہ کے بعد دوسری شادی کر لی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کیٹس کو تعلیم بند کر دینا پڑی۔ اب وہ ایسی تعلیم حاصل کرنی چاہتا تھا۔ جو اس کی آئندہ زندگی کے لئے اکل و شرب کی ضامن ہو سکے۔ لہذا پندرہ برس کی عمر میں اس نے اپنے پرانے مدرسے کو الوداع کہا۔ اور مسٹر ہیمونڈ کے دارالجراحی میں ایک شاگرد کی حیثیت سے داخل ہو گیا۔

اس غیر شاعرانہ ماحول کے باوجود کیٹس کا ادبی ذوق بدستور رہا۔ اور وہ اپنے پرانے اسکول میں جو دارالجراحی سے قریب ہی تھا۔ وقتاً فوقتاً جاتا رہا۔ اس زمانے میں سپنسر اور الزبتھ کے عہد کی شاعری نے جان کیٹس کی تمام تر توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ وہ حیران ہو کر شیکسپیئر اور اس کے معاصرین کے بیباک تخیل کو دیکھتا۔ اور جس اُستادانہ مہارت سے وہ الفاظ کو توڑ موڑ کر اپنا لیتے تھے دیکھ دیکھ کر جھوم جھوم جاتا۔ اسی زمانے میں اُسے یہ احساس بھی ہوا۔ کہ وہ خود ایک شاعر ہو سکتا ہے۔ اس احساس نے کیٹس کو بہت جلد حلقۂ احباب میں

ایک شاعر کی حیثیت سے ہر دلعزیز بنا دیا۔

کیٹس کی شاعرانہ طبیعت بہت جلد وار الجراحی کی احساس گش فضا سے اُکتا گئی۔ اور وہ اپنے اُستاد سے جھگڑ پڑا۔ نتیجۃً اُسے جراحی سے دست بردار ہونا پڑا اور وہ لندن میں طب سیکھنے کے لئے چلا گیا۔ لیکن یہ پیشہ اور شاعرانہ طبیعت! بھلا ان متضاد مشرقین کا باہم مل جانا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ جان کیٹس جلد ہی اس سے بھی گھبرا گیا۔ اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شاعری ہی کا ہو رہا۔

کیٹس کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۸۱۷ء میں شایع ہوا۔ یہ مجموعہ گو مستقبل کے ایک عظیم المرتبت شاعر کا کلام تھا۔ تاہم نومشقی کی تمام خامیاں اس میں موجود تھیں۔ مزید براں اُس وقت تک شیلے اور کولرج رومانیت کے بہترین شہ پارے پیش کر چکے تھے۔ اس لئے اِس مجموعہ کو کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا بلکہ اس پر سخت ترین تنقیدیں ہوئیں۔ اور اخباروں نے اس کے خلاف اِتنا شور مچایا۔ کہ کیٹس کو سخت صدمہ ہؤا۔ لیکن خوش قسمتی سے اُسے اس وقت ایک ہمدرد دوست مل گیا۔ جس نے اُسے شیلے سے رُوشناس کرایا۔ اور اس کے کلام پر ہمت افروز تبصرہ بھی ایک پرچے میں شائع کر دیا۔

اِس کتاب کی اشاعت کے دوسرے سال ایک دوسرا مجموعہ شایع کیا گیا

جو باوجودیکہ پہلی کوشش سے بہت زیادہ کامیاب تھا۔ اور جس میں کیٹس کی غیر معمولی ذہانت آہستہ آہستہ پر و بال نکالتی نظر آتی تھی۔ تاہم عوام نے اسے بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ "بلیک ورڈز میگزین" اور "کوارٹرلی ریویو" میں اس پر سخت تنقیدیں کی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ وہ لوگ جو شاعری کی صحیح رُوح کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ کیٹس کے مخالف ہو گئے۔ اور اس پر چاروں طرف سے آوازے کسے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ بعض اوقات جب کیٹس کہیں سے گذرتا۔ تو لوگ اس کو "یہ بھی شاعر ہے" کہہ کر دِق کیا کرتے۔

یہ درست ہے۔ کہ اس بے پناہ مخالفت نے کیٹس کے احساسات پر ایک زبردست ضرب لگائی۔ لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہی مخالفت اس کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ میرے خیال میں کیٹس اتنا بزدل نہیں ہو سکتا۔ کہ محض مخالفت سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ میرے اس نظریہ کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر کیٹس نے حقیقتاً اس مخالفت کو اتنی وقعت دی ہوتی۔ تو اُس کا تیسرا مجموعۂ کلام ہرگز اتنا بلند پایہ نہ ہوتا۔ کہ وہ یکدم ایک معمولی شاعر کی حیثیت سے اچھل کر انگریزی ادب کے بہترین شعراء کی صف میں آ کھڑا

ہوتا۔ یہ محض شیلے کی شاعرانہ تعلّی ہے۔ جس نے کیٹس کی موت کی سب سے بڑی وجہ مخالف تنقیدوں کو قرار دیا۔ اور کتنی بڑی غلطی ہے۔ کہ ایک محبت کرنے والے دوست کے متعصب اظہارِ غضب کو تاریخی حقیقت سمجھ لیا گیا ہے۔

بہر حال کیٹس کے ان دو مجموعوں کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ اور مخالفوں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی۔ کہ کیٹس کو انگریزی ادب میں قدم رکھنے کی جگہ نہ ملے۔ لیکن وہ جوہر جو قدرت کی طرف سے کسی شخص کو مرحمت ہوتا ہے۔ اپنا خراج لئے بغیر ضائع نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے کیٹس کو شاعر بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ اُسے شاعر بننا تھا۔ اور اس کے سامنے اس کے تمام مخالفین کے سر جھکنے تھے۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ اور ۱۸۱۸ء کا وسطی زمانہ کیٹس کی شاعری کے لئے ایک نئی زندگی لے کر آیا۔

۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیانی زمانہ میں کیٹس کی شاعری معراج پر تھی۔ اس زمانے میں اس نے ہایپرین۔ لیمیہ۔ دی ایو آف سینٹ ایگنیز جیسی لافانی نظمیں کہیں۔ اور اسی زمانے میں وہ سانیٹ بھی کہے۔ جو کیٹس کو شیکسپیئر کے پہلو میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کیٹس کی زندگی کا بیک وقت رنگین اور قاتل دور

شروع ہوا۔ اگست ۱۸۱۸ء میں وہ آوارہ مزاج فینی براؤننگ سے پہلی مرتبہ ملا۔ اور بہت جلد اس چنچل حسینہ کے عشق نے کیٹس کی ساری رُوح کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ لیکن یہ لڑکی اس عظیم الشان شخصیت کے نازک دل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے اسے رُلا رُلا کر اور تڑپا تڑپا کر مارا۔ اس کے ساتھ ہی تپ دق کا مہلک عارضہ بھی جڑ پکڑنے لگا۔ اور آخر ناکامیِ محبت کے شدید غم اور بیماری کے مہلک اثرات نے کیٹس کی شاعرانہ قوتوں کو سلب کر لیا۔ دنیا ایک دوسرے شیکسپیئر کی تخیل آفرینیوں سے محروم کر دی گئی۔

۱۸۲۰ء میں خون تھوکنے کا شدید دورہ پڑا۔ اور کیٹس کو یقین کرنا پڑا کہ اس کی زندگی ختم ہونے کو آئی ہے۔ جب دَورے کا اثر قدرے کم ہوا۔ تو اس نے ہوا بدلنے اور اپنے متلاطم جذبات کو سکون پہنچانے کے لئے سفر کا ارادہ کیا۔ اور نیپلز کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں سے ہوتا ہوا یونان پہنچا۔ ابھی یونان میں مقیم ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گذرا تھا۔ کہ خون کا دُوسرا دَورہ پڑا۔ اور کیٹس کمزور ہوتا گیا۔ آخر ۲۶ سال کی عمر میں حُسن کا یہ سچا پجاری اور دُنیا کا عظیم الشان شاعر داعیِ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

کیٹس کی شاعری پر ایک اجمالی نظر

مجموعی حیثیت سے کیٹس کی شاعری ایک ایسے غیر معمولی ذہین شخص کی انتہائی

کوششوں کا نمونہ ہے۔ جو اپنے تخیّل کے لئے سماجی اور وقتی ہنگاموں سے یکسر بے نیاز فضا پیدا کرنا چاہتا ہو۔ نیچر کے جمالیاتی پہلو کو صنمیاتی رنگ میں رنگ دے۔ اور پھر اس فضا میں جو خیالات و افکار پیدا ہوں۔ انہیں شاعرانہ اصول و ضوابط کے ساتھ پیش کرے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے کیٹس کی نمایاں خصوصیت اس کی جذباتی حس ہے۔ نیچر کا جمال دیکھ کر شاعر کے دل میں بے پناہ جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ وہ خداداد تعمّق نظر سے مناظر کے حسن میں سے معیاری خوبیاں اخذ کر لیتا ہے۔ اور پھر ان تمام احساسات کو مترنّم زبان میں قلمبند کر دیتا ہے۔ یہ کیٹس کی شاعری ہے!

اب اگر ہم اُس کی شاعری کے ارتقائی مراحل پر طائرانہ نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ کیٹس تین مختلف مدارج میں سے ہو کر گذرا ہے۔

(۱) آغاز میں وہ ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی سے بہت حد تک متأثر ہوا۔ وہ بھی ورڈز ورتھ کی طرح قدرتی مناظر کو ایک حسن مستور کا نقاب تصوّر کرتا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُسی زمانے کے آخری ایّام میں ورڈز ورتھ کا یہ اثر زائل ہونے لگا۔ اور وہ عہدِ عتیق کے یونانی شعراء کا زیادہ مدّاح ہوتا گیا۔ نتیجۃً نیچر پرستی کے نظریہ میں بھی انقلاب آنے لگا۔ اور کیٹس یونانی شعرا کی طرح نیچر کو بذاتِ خود ایک

قوت سمجھنے لگا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ ورڈز ورتھ کے نقطۂ خیال سے ہٹ کر اپنے لئے دوسری راہ نکالنا کیٹس کے لئے ایک طبعی مجبوری تھی۔ ایک مہلک بیماری کے جراثیم اس کے خون میں موجود تھے۔ اور وہ زندگی کو محض خیالات کا مجموعہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ زندگی میں کسی خاص سنسنی کا طالب تھا۔ ایسی سنسنی جو اس کی زندگی کو یکسر انہماک اور مسلسل خود فراموشی بنا دے۔

اس زمانے میں کیٹس کے ذہن میں بلند خیالات کا ایک ہجوم موجود تھا۔ لیکن ان خیالات کو یکجا کر کے ان سے کوئی خاص نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت ابھی اس میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ تاہم اُسے اُمید تھی۔ کہ جلد یا بدیر ان خیالات میں تسلسل قائم ہو جائے گا۔ اور وہ معیاری چیزیں پیش کر سکے گا۔ چنانچہ اپنی ایک نظم "نیند اور شاعری" میں جو اس کی پہلی کتاب کی آخری نظم ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "بہر حال میرے سامنے ہر وقت خیالات کا ایک بے پناہ سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ اور میں اس میں اپنی آزادیٔ فکر کا تماشا کرتا ہوں۔ اور اسی میں مجھے شاعری کا منتہیٰ اور انجام نظر آتا ہے۔"

(۲) دوسرے دَور میں یہی خیال جو پہلے پہل دھندلے نقوش کی طرح اس کے

ذہن میں موجود تھا۔ آہستہ آہستہ شاعری میں علم الاصنام کو استعمال کرنے کی صورت میں متشکل ہونے لگا۔

ایلزبتھن عہد کے شعراء نے کیٹس کی اس دور کی شاعری پر خاص اثر کیا۔ وہ ان لوگوں کے تکلفاتِ شعری۔ بے باک تخیل۔ پُرجوش طرزِ بیان اور اُس رندانہ جرأت کو بڑا پسند کرتا تھا جس سے یہ الفاظ کو موڑ توڑ کر اپنا لیتے تھے۔ کیٹس نے بھی ان کا تتبع کیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

(۴) اس دور میں کیٹس کی شاعری اپنے معراج پہنچ چکی تھی۔ خیالات کا وہ بے پناہ سمندر جو اُسے اپنے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ اب متشکل ہونا شروع ہوا۔ اس وقت تک کیٹس کو اظہارِ جذبات پر اتنی قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ کہ وہ اُس حُسن کو جو اس کے تخیل میں پیدا ہوتا تھا۔ ایسے خوبصورت الفاظ میں ملبوس کر دیتا۔ کہ اس کے بیان میں ایک تصویر کی سی حقیقت نظر آنے لگتی۔ اور یہی خصوصیت ہے۔ جس نے کیٹس کو مصوّر شاعر بنا دیا۔

مسلسل تجربات نے کیٹس کو بتا دیا تھا۔ کہ اس کا تخیل کس میدان میں آزادی کے ساتھ اپنا جوہر دکھا سکتا ہے۔ اس لئے اس نے ایسے موضوع تجویز کئے۔ جو بذاتِ خود (Descriptive) ہیں۔ لیمیہ۔ ازابیلا۔

دی ایو آف سینٹ ایگنیز میں اس کے طرزِ بیان اور خصوصیاتِ کلام کا پُورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ اصل افسانے کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتا ہے۔ اور افسانے کی اُن تمام جزئیات کو جو حسین۔ جذبات انگیز اور تخیل کو بیدار کرنے والی ہوں بیان کرنے میں اپنی ساری شاعرانہ قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے تمام افسانوں کے ہیرو بے ہوش ہو جانے والے اور دوسروں کے دھوکے میں آ جانے والے کمزور لوگ ہیں۔ جن کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ لیکن حسین ازابیلا کا غم ایسے دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ کوئی متنفس اُس سے ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس زمانے میں کیٹس نے جتنے سانیٹ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے بعض نہ صرف کیٹس ہی کے شاہکار ہیں۔ بلکہ انگریزی زبان میں ان کا مثل ملنا مشکل ہے۔ الفاظ کا ترنم۔ خیال کی ندرت اور دلچسپی۔ اچھوتے مضامین اور لفظوں ہی لفظوں میں منظر کو نگاہوں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت کیٹس زبان کے بہترین شعرا کی صفِ اوّل میں جگہ دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ کیٹس کی شاعری رومان و نغمات کی ایسی جنت
ہے جس کی وادیوں میں پھرتے وقت انسان اس سے بہت بلند ہو کر
ایک ایسی فضا میں سانس لینے لگتا ہے جہاں دردمند کا ہر آنسو کائنات
سے گراں اور مزدور کی ہر آہ ساری خدائی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے

دی ایو آف سینٹ ایگنیز (The Eve of St: Agnes)

کیٹس کی پختہ کاری کے زمانے کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ جو اسکی توصیفی (Descriptive) نظموں میں بہترین خیال کی جاتی ہے۔

اس نظم کا پلاٹ برٹن کی (Anatomy of Melancholy) سے لیا گیا ہے برٹن کی کہانی ایک معمولی کہانی ہے۔ جو شاعرانہ تخیّل اور زورِ بیان سے معرا ہونے کی وجہ سے بہت ہی غیر دلچسپ ہے۔ لیکن جب یہی موادِ حُسن پرست اور محبت کے شیدائی کیٹس کے ہاتھ لگتا ہے۔ تو وہ اس میں ایسی رُوح پھونک دیتا ہے۔ کہ ساری کہانی بذاتِ خود ایک حسین شعر بن جاتی ہے۔

لفظوں ہی لفظوں میں ایک تصویر پیش کر دیتے ہیں جو کمال کیٹس کو حاصل ہے۔ وہ اُس زمانے کے اور کسی شاعر کو نہیں۔ اُندھا دیوتا کیٹس کے اِس مخصوص طرزِ تحریر کا شاہکار ہے۔ نظم کے پہلے بند میں جن مترنم الفاظ میں اُس نے سردی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ اُسی کا حصہ ہے۔ اور پھر جس خوبصورتی سے میڈیلاین کے کمرے کی ایک کھڑکی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ حقیقتاً قابلِ داد ہے۔

سینٹ ایگنیز کے میلے کی شام! اُف! کس قدر سرد تھی وہ شام! اُلّو اپنے پروں کے لاتعداد بالوں کے باوجود شدّتِ سرما سے ٹھٹھرا جاتا تھا۔ وحشی ہرن برف پوش گھاس کے درمیان سکڑتا اور کانپتا پھر رہا تھا۔ اور بھیڑوں کا ریوڑ اُونی لبادوں میں مکمل سکون و سکوت لپٹا بیٹھا تھا۔ عابد کی اُنگلیاں تسبیح کے دانوں پر چلتے وقت اکڑی جاتی تھیں۔ اور جب وہ مقدّس مریم کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر دعا گنگناتا۔ تو اس کا کُہر آسا تنفّس کسی پُرانے بخوردان میں سے تقدّس مآب اور غیر فانی دھوئیں کی طرح اُٹھ کر مقدّس ماں کے قدموں سے لپٹتا ہوا عرش کی طرف اُڑ جاتا تھا۔

یہ صابر و پاک نفس انسان دعا ختم کر چکا۔ دیا اُٹھایا۔ خود اُٹھا۔ اور افسردہ مضمحل ننگے پاؤں۔ زرد رو گرجے کے بین الصفوف آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اعرافی سلاخوں میں مقید مجسّمے منجمد ہو گئے ہیں۔

وہ بہادروں اور خواتین کے قریب سے گذرتا گیا۔ جو خموشی کی بلاغت میں محوِ دعا تھے۔ اور جب اُسے خیال آتا۔ کہ کس طرح یہ بہادر برف زدہ خودوں اور زرہ بکتروں میں ٹھٹھر کر اکڑ جائیں گے۔ تو اس کی رُوح کانپ اُٹھتی۔

وہ ایک چھوٹے سے دروازے میں سے ہوتا ہوا شمال کی طرف گیا۔ اور ابھی چند قدم ہی چلا تھا۔ کہ موسیقی کی سنہری زبان نے اس غریب معمّر انسان کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن نہیں —— اس کی موت کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ اس کی طویل عمر کی تمام مسرّتیں ایک ایک کر کے ختم ہو چکی ہیں۔ اور آج کی رات اس کے لئے مجسّم کفارہ بن کر آئی ہے۔ وہ ایک اور راستے پر چل دیا۔ اور جلد ہی اپنی رُوح کو تسکین دینے کے لئے نا ملائم راکھ پر بیٹھ گیا۔ وہ تمام رات بیدار رہا۔ کیونکہ گنہگار کا کام ہی رونا ہے۔

اِدھر اُدھر جلدی میں آنے جانے سے دروازے کُھلے رہ گئے تھے۔ اس لئے معمّر عابد نے پہلے حسین اشعار سُن لئے۔ جلد ہی نقرئی نفیریوں کی صدائے تہدید بن کر بلند ہوئی۔ درمیانی کمرے اپنی شوکت و تجمّل کے غرور کے ساتھ ہزاروں مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ متحیّر نگاہوں والے فرشتوں کے مجسّمے جن کے سروں پر برف جمی ہوئی تھی۔ جن کے سر کے بال

پیچھے کی طرف اُڑ رہے تھے۔ اور جن کے پر سینے پر لپٹ گئے تھے۔ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

بالآخر محفلِ سرور کے لاتعداد ارکان اپنے آپ کو کلغیوں، مرصّع کمٹوں اور بیش قیمت ملبوسات سے سنوارے کمروں میں اس طرح آ گئے جس طرح نوجوان دماغ میں جس کے پردوں پر پُرانے رومانوں کے مسرور اور نڈر بہادروں کا سکہ بیٹھا ہو۔ ہزاروں دلفریب تمنّاؤں کے سائے تصوّر کی ایک ہی جست میں لرزنے لگتے ہیں۔ لیکن ہم ان سب کو چھوڑ کر اپنے خیال کی تمام قوتیں اُن میں سے ایک خاتون پر مرکوز کئے دیتے ہیں۔ جس نے سردیوں کا دن محبت اور پردار سینٹ ایگنیز کی شفقتوں کے متعلق سوچنے میں بسر کر دیا تھا۔

اُس نے کئی دفعہ بوڑھی عورتوں کی زبانی سُنا تھا۔ کہ اگر نا کتخدا لڑکیاں سینٹ ایگنیز کے میلے کی رات میں تمام رسوم پوری طرح ادا کریں۔ تو نصف شب کے سکرزا وقت میں وہ سرور انگیز خواب دیکھیں گی۔ خواب میں ان کے بچھڑے ہوئے محبوب انہیں مل جائیں گے۔ اور اپنی غیر فانی محبت کا اظہار کریں گے۔ ایسی لڑکیاں جو خواب میں اپنے محبوب کو دیکھنا چاہیں۔ انہیں چاہئے۔ کہ شام کے وقت کچھ کھائے بغیر اپنے یاسمین جسم کو سیدھا لٹا دیں۔ نہ پچھلی طرف

دیکھیں۔ نہ ہی اُن کی نظریں بائیں کو اُٹھیں اور نہ ہی دائیں کو۔ بلکہ آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں نگاہیں گاڑے خدائے مقدس سے اپنی تمناؤں کی تکمیل چاہیں۔

متفکر میڈالین اسی وہم میں غرق تھی۔ اُس نے اُس بلند آہنگ موسیقی کو بھی نہیں سُنا جو کسی دردمند دیوتا کی پکار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پاکباز ملکوتی نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ لاتعداد انسانوں کو اپنے قریب سے گذرتا ہوا دیکھ رہی تھی ـــــ اُس نے کوئی آواز نہیں سُنی۔ بہت سے خود بین شہسوار پنجوں پر چلتے ہوئے اس کے قریب آتے۔ لیکن بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتے۔ اس کا دل برف کا ٹکڑا بن گیا تھا۔ نفرت سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ کچھ دیکھتی ہی نہ تھی۔ اس کے خیالات کسی اور طرف تھے۔ وہ آج کی رات کے اُن حسین خوابوں کے لئے سرد آہیں بھر رہی تھی۔ جو اس طویل سال کا بہترین حصّہ ہوں گے۔

وہ ـــــ بے نور آنکھوں کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر اضطراب تھرا رہا تھا۔ اور اس کی سانس اکھڑی جاتی تھی۔ وہ مقدس ومت قریب تر ہوا جاتا تھا۔ وہ غصّے یا ہنسی کھیل کی بلند و کرخت آوازوں کے

درمیان ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہی۔ وہ محبّت۔ کراہت۔ نفرت اور طنز کی نگاہوں کو خواب شیریں کی ڈھالوں پر روکتی رہی۔

وہ ہر لمحے جانے کے لئے تیار رہتی۔ لیکن پھر رُک جاتی۔ اس اثنا میں نوجوان پرفیرو اپنے دل میں میڈالین کی محبّت کا طوفانِ آتش دبائے ویران جنگلات میں سے گذرتا ہوا آپہنچا۔ وہ بڑے دروازے کے قریب لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تمام مقدس ولیوں سے دعا کرنے لگا۔ کہ اُسے ایک دفعہ میڈالین کو دیکھ لینے کی اجازت دیدی جائے۔ ان مضطرب ساعتوں میں صرف ایک لمحہ ایسا مل جائے۔ جس میں وہ اُن تمام غیر مرئی قوتوں کی پرستش کر سکے۔ جو میڈالین کے لب و رخسار میں سمٹ آئی ہیں۔ شاید وہ اُس سے ہمکلام بھی ہو سکے۔ اس کے سامنے دوزانو ہو سکے۔ اس کے ملکوتی جسم کو چھُو سکے۔ ایک بوسہ دے سکے ـــــ آہ! یہ سب باتیں دنیا میں ہوتی رہی ہیں۔

وہ جرأت کر کے اندر چلا گیا۔ کاٹ ڈالو بدنامی کی زبان تاکہ ایک حرف بھی سُنائی نہ دے سکے! پٹیاں باندھ دو ان تمام آنکھوں پر ورنہ اس کے دل میں ـــــ محبّت کے اُس نازک معبد میں ـــــ ہزاروں

برچھیاں اُتر جائیں گی۔ کیونکہ یہ کمرہ ایسے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو اس نوجوان کے حق میں بربریوں سے کم نہیں۔ جن کی دشمنی ازلی ہے۔ یہ ایسے اُمرا ہیں۔ جن کے کُتّے بھی اگر اسے دیکھ پائیں گے۔ تو اس کے خاندان کی بڑھیوں کو نوچ کر رکھ دیں گے۔ انسانوں کے اس بھرے ہوئے کمرے میں کوئی دل ایسا نہیں۔ جس میں اس کے لئے ہمدردی موجود ہو۔ سوائے ایک ضعیفہ کے جس کی رُوح اس کے رعشہ زدہ جسم کی طرح کمزور ہے۔

کتنی خوش نصیب تھی وہ گھڑی! بوڑھی خاتون ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی ہلاتی اُس طرف آگئی۔ جہاں وہ شمع کی روشنی سے بچ کر اور مسرت بیز آوازوں سے بہت پرے کمرے کے عظیم الجثہ ستون کے سائے میں سمٹا کھڑا تھا۔ اس نے بڑھیا کو چونکا دیا۔ لیکن اُس نے جلد ہی اُس مانوس حسین چہرے کو پہچان لیا۔ حیرت زدہ ہو کر اپنی انگلیاں اپنے رعشہ زدہ ہاتھ میں بھینچ لیں۔ "اپنے اُوپر رحم کرو بر فیرو! بھاگ جاؤ یہاں سے۔ آج کی رات وہ سب یہاں جمع ہیں۔ اُس خون آشام قوم کے سارے افراد! بھاگ جاؤ یہاں سے —— بھاگو! وحشی بلدار براند بھی یہیں پر ہے۔ اسے ابھی ابھی دَورہ پڑا تھا۔ اور وہ اسی ہذیان میں تمہیں۔ تمہاری

قوم کو اور ہر چیز کو جس سے تمہارا کچھ بھی تعلق ہے بے نقط سُنا رہا تھا۔ اور پھر یہاں بوڑھا نواب مورس بھی ہے۔ جو اپنے سفید بالوں کے باوجود ویسا ہی وحشی اور ظالم ہے۔ اُف میرے معبود۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ کسی بھوت کی طرح گم ہو جاؤ —— مقدس ولیو! یہاں نہیں۔ یہاں نہیں میرے بچے! میرے ساتھ آؤ۔ ورنہ یہی پتھر تمہارا کفن بن جائیں گے۔"

وہ اُس کے پیچھے پیچھے ایک تنگ محراب تلے گذرتا گیا۔ اس کی ٹوپی کا بلند پر چھت پر لگے ہوئے مکڑی کے جالے اُتار رہا تھا۔ آخر جب بوڑھی خاتون نے ہلکی آواز میں کہا۔ "اچھا —— اچھا"۔ تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ جس میں چاند کی سیم پاش شعاعیں تیر رہی تھیں۔ یہ کمرہ قبر کی طرح زرد بند۔ سرد اور خاموش تھا۔ "اب مجھے بتاؤ۔ کہ میڈیلائن کہاں ہے"؟ اس نے کہا۔ "تمہیں قسم ہے اُس مقدس کرگھوں کی جس پر پُر اسرار کنواریاں سینٹ اگینز کی بھیڑوں کی اُون بنتی ہیں۔ اور جو ان کے سوا اور کسی کو نظر نہیں آسکتے مجھے بتاؤ میرا وہ حسین خواب کہاں ہے"؟

"سینٹ اگینز! آہ! آج سینٹ اگینز کے میلے کی رات ہے۔ لیکن انسان مقدس دنوں میں بھی خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس خواہش کی

تکمیل کا خیال کرنے سے پہلے تم ساحرہ کی چھلنی میں پانی بھر لو یا کوہ قاف کے تمام طلسمی غاروں کے حاکم اعلےٰ بنو! پرفیرو! میں تمہیں اس جگہ دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوں۔ سینٹ اگینیز کے میلے کی رات ہے آج! خدائے مقدس مدد فرمائے۔ یہ کسی ساحر کی شعبدہ بازی ہے۔ میری حسین مالکہ کے محافظ فرشتوں نے شاید آج اُسے دھوکا دیا ہے۔ لیکن ٹھیرو! مجھے چند لمحوں کے لئے ہنس لینے دو۔ میری آیندہ زندگی کا ہر لمحہ میرے لئے آنسوؤں کے سمندر لا رہا ہے۔"

وہ ضعیف آواز میں ہنستی رہی اور پرفیرو اُس حیرت زدہ بچے کی طرح اس کا منہ تکتا رہا۔ جو آتشدان کے قریب بیٹھی عینک والی بوڑھی نانی کے ہاتھ میں پہیلیوں کی کتاب کو حیرت سے دیکھ رہا ہو۔ لیکن جلد ہی جب اُس نے پرفیرو کو اس کی محبوبہ کے عزم سے مطلع کیا۔ تو اس کی آنکھوں میں نورانی شعلے لپکنے لگے۔ اُس سحر بارد کے خیال نے جس کے زیر اثر میڈیلائن عہدِ عتیق کے نغمہ ہائے عشق کی گود میں سو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کو محبت کے پاکیزہ موتیوں سے بھر دیا۔

دفعتہً ایک خیال گلاب کے پورے کھلے ہوئے پھول کی طرح آیا۔ اس کی پیشانی گلابی ہوگئی۔ اور اس کے درد بھرے دل میں ایک میٹھی کسک پیدا

کر گیا۔ اور پھر اُس نے دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک دینے کی ترکیب سوچی۔ جس نے بوڑھی خاتون کو لرزہ براندام کر دیا۔ "تم ایک ظالم اور کینہ توز فطرت کے انسان ہو۔ اُس حُسنِ مجسّم کو عبادت کر کے سونے دو۔ اور اُسے اجازت دو کہ وہ تم جیسے سیاہ قلب انسان سے بہت دُور رہ کر اپنے محافظ فرشتوں کے پروں کے سائے تلے اپنے حسین خواب میں مشغول ہو جائے۔ جاؤ جاؤ! میں سمجھ گئی۔ کہ تم وہ نہیں ہو جو تم دکھائی دیتے ہو۔"

"میں سارے ولیوں کی قسم کھاتا ہوں۔ کہ میں اُسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔" پرفیرو نے کہا۔ اگر میں اس کی گھنگریالی زلفوں کا ایک بال بھی ادھر سے اُدھر کر دوں۔ یا اس کے فرشتوں ایسے حسین اور معصوم چہرے پر جذبات کی آگ سے جلتی ہوئی نگاہوں کی ایک نظر بھی ڈال دوں۔ تو مجھے اُس وقت شفاعت نصیب نہ ہو۔ جب میرے کانپتے ہوئے ہونٹ نحیف آواز میں آخری دفعہ اس کا نام پکاریں۔ اچھی انگیلا! میرے ان آنسوؤں پر اعتماد رکھو۔ ورنہ میں ایک منٹ میں چیخ کر اپنے خوفناک دشمنوں کے کان کھڑے کر دوں گا اور خواہ وہ وحشی بھیڑیوں سے بھی زیادہ خونخوار کیوں نہ ہوں۔ میں اُن کی داڑھیاں نوچ لوں گا۔"

"ہائے! آخر تم اِس نازک دل کو خوف کے پنجوں میں دے دینے پر کیوں تُل گئے ہو؟ ایک غریب۔ کمزور۔ رعشہ زدہ کلیسائی عورت کا دل جس کی آخری گھڑی شاید اسی نصف شب میں آئے۔ جس نے اپنی عمر کی کوئی صبح کوئی شام تمہارے حال میں دعا کئے بغیر نہیں گذاری"۔ اِن الفاظ نے آتش عشق و غضب میں جلتے ہوئے پرفیرو کی زبان سے ملائم الفاظ نکلوا لئے۔ یہ الفاظ کس قدر دردانگیز تھے۔ کس قدر عمیق خلش کے آئینہ دار! یہاں تک کہ بوڑھی انگیلا نے بھی وعدہ کر لیا۔ کہ وہ جو کچھ کہے گا کرے گی۔ خواہ اس میں اس کے بوڑھے سر پر آفات کا پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔

اس کی خواہش تھی۔ کہ انگیلا اُسے چھپا کر میڈیلاین کے کمرے تک لے جائے۔ اور وہاں اُسے کسی ایسے پوشیدہ کمرے میں چھپا دے۔ جہاں وہ اُس پاکیزہ حُسن کو اس طرح چھُپ کر دیکھ لے۔ کہ کوئی دوسری آنکھ انہیں نہ دیکھ سکے۔ شاید وہ اس رات جبکہ لاتعداد پریوں کے جھرمٹ کمرے کی چادروں پر محوِ رقص ہوں گے۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں کے پپوٹے محبت کے جادو تلے جھکے ہوں گے۔ وہ ایک بے مثل بیوی کا شوہر بن جائے۔ جس وقت سے مارلن نے شیطان کی چوکھٹ پر کریہہ ترین قربانی چڑھائی۔ اُس دن

سے ایسی رات کے وقت کبھی کوئی عاشق و معشوق یکجا نہیں ہوئے۔

"جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا"۔ بڑھیا نے کہا "آج دعوت کی رات ہے لذیذ ترین کھانے اور نفیس ترین شرابیں وہاں جمع ہوں گی۔ تم کلیسا کی برساتی کے قریب اس کا بانسری ایسا سراپا خود دیکھ لوگے۔ ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو۔ کیونکہ میں بے انتہا سُست رفتار اور کمزور ہوں۔ اور اپنے رعشہ زدہ سر کے ہاتھوں ایسا اہم فرض تفویض نہیں کر سکتی۔ میرے بچے صبر سے میرا انتظار کرو۔ اس اثنا میں دوزانو ہو کر خدائے قدوس کی درگاہ میں دعا کرو۔ تمہاری شادی اُس خاتون سے ہو کر رہے گی۔ ورنہ خدا حشر کے دن مجھے انسانوں میں سے نہ اُٹھائے"۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اور محبت کرنے والے کی کبھی نہ ختم ہونے والی گھڑیاں آہستہ آہستہ گذرتی گئیں۔ آخر بوڑھی خاتون واپس آگئی۔ اور بڑی ہی دھیمی آواز میں اُسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کی آنکھیں رازداری کے خوف سے پھٹی پڑتی تھیں۔ آخر بہت سے دھندلے راستے طے کرنے کے بعد وہ اس حسینہ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ جس پر چاروں طرف قیمتی ریشم کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ اور جس کی خموشی عفت کی ایک ادا معلوم ہوتی تھی۔ پرفیرو

کی مسرّت کی انتہا نہ رہی۔ وہ چھُپ کر ایک کونے میں ہو بیٹھا۔ اس کی رہبر ذہنی کرب میں مبتلا تھی۔ اس لئے جلد ہی واپس چلی گئی۔

بوڑھی انگیلا اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سیڑھیاں ٹٹول رہی تھی جب سینٹ ایگنیز کی سحرزدہ دوشیزہ —— میڈیلاین —— ایک بے صبر حُور کی طرح ظاہر ہوئی۔ وہ سیمیں شمع دانوں کی ہلکی روشنی میں احتیاط سے قدم دھرتی ہوئی آئی۔ اور بوڑھی سُشنا سا نیچے چٹایوں پر جا بیٹھی۔ نوجوان پرفیرو! اُس بستر کو دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ وہ آتی ہے —— وہ پھر آتی ہے۔ ایک خوفزدہ قمری کی طرح!

جب وہ تیز قدم رکھتی ہوئی اندر آئی۔ تو شمع بجھ گئی۔ دھوئیں کی پتلی سی لکیر چاند کی زرد شعاعوں میں تحلیل ہو کر گُم ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور ہانپنے لگی۔ وہ اس وقت انسان نہیں۔ بلکہ باغِ قدس یا خواب زریں کی رُوح معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کوئی ایسا لفظ نہیں سُنا تھا۔ جو اس کے لئے باعثِ آزار ہوتا۔ اور نہ ہی اُسے کسی قسم کا کوئی ڈر تھا لیکن اس کا دل —— اس کا دل پھیل رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی نازک پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ گویا ایک ایسا بلبل جس کی

زبان کاٹ دی گئی ہو۔ گانے کے لئے اپنا گلا پھُلا تا رہے۔ اور دم گھُٹ جانے کی وجہ سے اپنے پنجرے میں تڑپ کر دم توڑ دے۔

اس جگہ ایک بلند قامت کھڑکی تھی۔ جس پر تہری محرابیں بنی ہوئی تھیں اس پر پھُول پھل اور پتّوں کے گچھوں کی تصاویر کھُدی ہوئی تھیں۔ اور مختلف رنگوں کے شیشوں کے ٹکڑوں سے یہ تتلی کے منقّش پر سے مشابہ تھی۔ ہزاروں گھوڑوں۔ اولیاء اور دیگر دھُندلے نقش و نگار کے درمیان تالاپتی موجود تھا جو ہزاروں بادشاہوں اور بادشاہزادیوں کے خون سے لالہ زار تھا۔

موسم سرما کا چاند اس کھڑکی پر اپنی پُوری تابانیوں سے چمک رہا تھا اور جب میڈیلاین خدا کی بارگاہ میں رحمت و ہمّت کی بھیک مانگنے کے لئے جھُکی۔ تو اسی چاند کی ایک نحیف سی شعاع اس کے سینے پر کھیلنے لگی۔ اس کے آپس میں پیوست ہاتھوں پر گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ چاندی کی صلیب پر یاقوتِ حجری کا چھوٹا سا ٹکڑا دمک رہا تھا۔ اور اس کے بالوں پر کسی مقدّس ولی کا سا جلال کھیل رہا تھا۔ وہ ایک پُر شوکت فرشتہ معلوم ہوتی تھی۔ جو عرش کی طرف پرواز کرنے کو تیار تھا۔ پرفیرو پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔ وہ مقدّس، فنا کی حدوں سے پرے رہنے والی ہستی

دوزانو ہوگئی۔

لیکن جلد ہی وہ ہوش میں آگیا۔ اس کی دعائیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے بالوں سے یاقوتی ہار اُتار لئے۔ اور ایک ایک کر کے تمام جواہرات بھی جسم سے علیحدہ کر دیئے۔ معطر لبادہ بھی اُتار دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا قیمتی لباس کھسکتا ہوا اس کے گھٹنوں پر آگیا۔ کسی سمندری حور کی طرح جس کا نصف جسم سمندری گھاس میں چھپا ہوا ہو۔ اس نے جاگتے میں خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ حسین سینٹ ایگنیز اس کے بستر میں مصروفِ راحت ہے۔ لیکن اُسے اپنی پُشت کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مبادا یہ ہوشربا طلسم پاش پاش ہو جائے۔

آخر وہ کانپتی ہوئی بیدار ہونے کے باوجود بے ہوشی کے عالم میں اپنے نرم اور سرد گھونسلے میں لیٹ گئی۔ یہاں تک کہ نیند کی سکر پاش حرارت نے اس کے تھکے ہوئے اعضا کو راحت کی گود میں لے لیا۔ اور رُوح کی تکان رفع ہو گئی۔ وہ ایک خیال کی طرح رنج و راحت کی دُنیا سے دُور چلی گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُس کتابِ نماز کی طرح جو سیاہ فام بے دین پڑھا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کھلا ہوا گلاب دھوپ اور بارش سے بند ہو کر پھر غنچہ بن گیا ہے۔

اس فردوس نظر میں پہنچ کر پر فیرو مبہوت ہو گیا۔ اور اس کے کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے سانس کی آمد و شد کی دھیمی موسیقی کو سُنتا رہا۔ شاید کوئی لمحہ ایسا بھی آئے۔ جب یہی سانس محبت کے لذت آفریں راگ میں بدل جائے۔ وہ لمحہ کتنا دلفریب ہوگا۔ وہ کمرے میں سے کوئی آواز پیدا کئے بغیر وسیع و عریض جنگل میں خوف کی طرح اس کمرے کے سکون زا قالین پر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ پردوں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پردوں میں سے جھانک کر دیکھا —— کتنی گہری نیند میں سو رہی تھی وہ!

چارپائی کے قریب جہاں چاند کی ایک چھوٹی سی شعاع دھندلی روشنی بکھیر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے ایک میز رکھی۔ اور اس پہ سُرخ رنگ کا مطلّا رومال بچھا دیا۔ شاید یہ کسی تعویذ کا اثر تھا۔ کہ نصف رات کی بلند ہنگام قرنا اور ڈھول کی برانگیختہ کرنے والی آوازیں دُور سے اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ کمرے کا دروازہ بھِڑ بند ہوتا ہے۔ اور سارا شور و غوغا ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اب بھی معطر اور سفید ململ کی چادر اوڑھے میٹھی گہری نیند سو رہی تھی۔ اور پر فیرو اُس کمرے میں سے سُرخ سیب۔ بہی۔ آلوچہ اور طلائی آمیز دہی

سے زیادہ نرم اور لذیذ شیرینی۔ شہد ملے خوشبودار شربتوں سے بھری ہوئی تونبیاں اُٹھا لایا۔ اُس کے پاس ترکستان کا لہسن اور کھجوریں بھی تھیں سمرقندی ریشم اور البانوی زیتون غرض ہر لذیذ چیز اس کی جھولی میں موجود تھی۔

اس نے ان تمام لذائذ کو طلائی تھالیوں اور سیمیں تاروں سے بُنی ہوئی نفیس و خوبصورت ٹوکریوں میں سجا کر ایک جگہ رکھدیا۔ جہاں یہ رنگ و بُو کا حسین اجتماع رات کی خاموش فضا میں شانِ وقار کے ساتھ سر بلند کئے کمرے کی خنک ہوا کو لطیف خوشبوؤں میں بساتا رہا۔ میری محبت کے منتہا! میرے حسین فرشتے آنکھیں کھولو، تم میری جنت ہو اور میں تمہارا راہب ہوں۔ تمہیں معصوم سینٹ ایگنیز کی قسم یہ عفت پاش آنکھیں کھولو ورنہ میرے دل کی بے پناہ دھڑکنیں مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لئے سُلا دیں گی۔

یہ کہا اور اس کے گرم کانپتے ہوئے بازو میڈلاین کے تکئے میں دھنس گئے دھندلائے ہوئے پردوں نے اس کے حسین خواب کو اپنے تاریک سائے میں لے لیا۔ یہ سحر نیم شبی تھا۔ جس کا پگھل کر بیداری میں بدل جانا ایک یخ بستہ ندی کی طرح مشکل تھا۔ چاند ایک چاندی کی کشتی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور

چادر کا طلائی حاشیہ اُسی طرح بغیر کسی شکن کے موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی آنکھوں کو کبھی بھی اس ناقابلِ شکست جادو کی گرفت سے جدا نہ کر سکے گا۔ وہ چند لمحوں کے لئے اسی پیچیدہ کشمکش میں مبتلا رہا۔

پھر وہ اُٹھا اور اپنی محبوبہ کی بانسری لی۔ اس نے بڑی ہی دھیمی سُروں میں ایک پُرانا گیت "خوں آشام محبوبہ" گایا۔ جو مُدتوں سے ملک کے اس حصّہ میں متروک ہو چکا تھا۔ نغمے کی حسین اور نرم لہروں نے میڈلاین کے کانوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے اُسے بیدار کر دیا۔ اُس نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میڈیلاین کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ اور اس کی سہمی ہوئی آنکھیں کُھل کر چمک اُٹھیں۔ پرفیرو دو زانو ہو گیا۔ وہ نازک پتھر کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں۔ اور وہ پوری طرح بیدار تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین و جمیل خواب کی لطف فرمائیوں میں ایک کرب انگیز انقلاب رُونما ہوا۔ جس نے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے اور وہ بے معنی باتیں کہہ کہہ کر آہیں بھرنے لگی۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں پرفیرو کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جو ہاتھ باندھے اپنی آنکھوں میں التجائے

رحم کی دُنیا بسائے جھکا ہوا تھا۔ میڈیلائین اتنی خواب آلود معلوم ہوتی تھی۔ کہ وہ زبان کھولنے یا کسی قسم کی جنبش کرنے سے ڈرتا تھا۔

"پرفیرو"! اس نے کہا۔" ابھی ابھی تمہاری آواز میری سماعت میں ایک ایسی موسیقی بن کر سما رہی تھی۔ جسکے ہر زیر و بم میں محبّت کے حسین ترین وعدے مچل رہے تھے۔ اور یہ غم آفریں آنکھیں ملاء اعلےٰ کے نگینے معلوم ہوتی تھیں۔ تم کتنے بدل گئے ہو۔ کتنے پژمردہ، سرد اور خشک ہو گئے ہو۔ پیارے پرفیرو! مجھے پھر وہی آواز سُناؤ۔ میں انہی لافانی آنکھوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں وُہی میٹھے شکوے وُہی پیاری شکایتیں۔ اتنی غم آلود محبت مجھے پسند نہیں مجھے اِس لافانی کرب میں مت جھونکو۔ اگر تم مر گئے۔ تو دُنیا میں میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔

پرفیرو دفعتہً ایک فانی انسان سے ایک ملکوتی ہستی میں بدل گیا۔ اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اور وہ فضائے بسیط کی نیلگوں پہنائیوں میں چمکنے والے ستارے کی طرح دمک اُٹھا۔ جس طرح گلاب کی نزاکت میں بُو بس جاتی ہے۔ اسی طرح پرفیرو میڈیلاین کے خوابوں میں تحلیل ہو گیا۔ اس اثنا میں کُہر آلود ہوا کھڑکی کے تین آئینوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ اور سینٹ ایگینز کے میلے کی رات

کو سیلاب نسیم میں بدل دینے والا چاند آہستہ آہستہ غروب ہو گیا۔

"تاریکی چھا گئی ہے۔ اولے سرعت سے گر رہے ہیں۔ یہ خواب نہیں ہے میری محبوبہ! میری میڈیلاین۔ اندھیرا چھا گیا ہے۔ برف و باراں کا طوفان ابھی تک گرج رہا ہے۔" "یہ خواب نہیں ہے۔ آہ! آہ! یہ میں بدنصیب ہی ہوں۔ پرفیرو مجھے اسی جگہ مرجھا کر مر جانے کے لئے چھوڑ جائے گا۔ ظالم! کسی دغاباز نے تمہیں یہاں تک آنے دیا۔ باوجودیکہ تم ایک فریب خوردہ لڑکی کو ایک نُچے ہوئے پروں والی اور ٹکڑی سے بچھڑی ہوئی کونج کو اس طرح اکیلے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں بد دعا نہیں دیتی۔ آہ! میرے دل کی ساری دھڑکنیں تمہارے لئے ہی ہیں۔"

"میری میڈیلاین! حسین خواب دیکھنے والی میڈیلاین! حسین دُلہن! کہو کیا میری خوش نصیبی نے تمہیں ہمیشہ کے لئے میری مہربان بنا دیا ہے؟ کیا میرا دل ہمیشہ کے لئے تیرے حُسن کی ڈھال بن سکتا ہے؟ اتنے مصائب جھیلنے اور اسقدر تکالیف برداشت کرنے کے بعد میں اس روپہلی مندر میں آرام کروں گا۔ یہ معجزہ ہو گا۔ میں نے تمہیں پا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تمہارا گھونسلا برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم میرا اعتبار کرو۔ تو میری پیاری میڈیلاین تم مجھے وحشی بے دین

نہیں پاؤگی۔

سُنو! یہ طوفان پریوں کی سرزمین سے اُٹھا ہے۔ اور گو یہ ظاہر میں بڑا ہی تباہ کن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں رحمت ہے۔ اُٹھو! اُٹھو! صبح ہوئی چاہتی ہے۔ شرابِ طرب کے یہ بھولے ہوئے متوالے کبھی بھی کچھ نہ سُن سکیں گے۔ اُٹھو ہم انتہائی تیزی سے اُڑ چلیں۔ یہاں کوئی کان ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ سُن سکے۔ نہ ہی کوئی آنکھ ایسی ہے۔ جو ہمیں دیکھ سکے۔ یہ سب شراب اور نبیذ کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہیں۔ جاگو! اُٹھو! میری محبت کے ملتجی! اور بے خوف و خطر ہو جاؤ۔ جنگلوں کے اُس پار تمہارے لئے ایک مکان تیار ہے۔

یہ الفاظ سُن کر وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن خوف اب بھی اُس کی رگوں میں کانپ رہا تھا۔ کیونکہ چاروں طرف تیز آنکھوں والے خوفناک اژدھے بھالے لئے سو رہے تھے۔ وہ فراخ سیڑھیوں پر سے اُتر کر ایک تاریک راستے پر چل دیئے۔ تمام گھر میں کوئی انسانی آواز سُنائی نہ دیتی تھی ہر ایک دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ تیزی سے چلتی ہوئی ہوا کی طوفان خیزیوں میں منجمد دیبا کے پردے

اُڑ رہے تھے۔ اور بڑے بڑے قالین طوفان کی زد میں آئے ہوئے دروازے پر اُبھرے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ایک سائے کی طرح وسیع کمرے میں چلے گئے۔ اور سائے کی طرح آہن پوش دہلیز پر پہنچ گئے۔ جہاں چوکیدار ایک خالی صُراحی پاس رکھے تکلیف کی حالت میں سمٹا پڑا تھا۔ بیدار باش خونی شکاری کُتا جاگ اُٹھا۔ اور اپنی کھال جھٹکنے لگا۔ لیکن اس کی شعلہ بار آنکھوں نے اپنی مالکہ کو پہچان لیا۔ ایک ایک کر کے تمام زنجیریں آہستہ آہستہ اُتر گئیں۔ اور پاؤں کی پیہم ضربوں سے گھسے ہوئے پتھروں پر خاموشی سے پڑی رہیں۔ چابی گھومی اور دروازہ اپنے قلابوں پر چیخا۔

اور وہ چلے گئے۔ ہاں! ایک طویل زمانہ گذر چُکا ہے۔ جب محبت کے یہ دو لافانی پُتلے طوفانِ برف کا خیال کئے بغیر چلے گئے تھے۔ اُس رات بوڑھے نواب نے بھیانک خواب دیکھے۔ اور وہ فوجی بہادر جو اس کے مہمان تھے۔ تمام رات ساحروں کے سائے اور متحرک جسموں کو بھوتوں اور بڑے بڑے مُردہ خور کیڑوں کو دیکھ دیکھ کر مارے خوف کے کانپتے رہے۔ بوڑھی انگیلا رعشہ کی شدّت سے سُکڑ کر مر گئی۔ اور اس کا چھوٹا سا چہرہ بگڑ

گیا۔ اور سبحہ گرداں زاہد ہزار دانے گننے کے بعد راکھ پر لیٹ کر ٹھنڈا ہو گیا۔
اُسے ڈھونڈنے والا کوئی نہ تھا ۔

لیمیکہ

عبدالرحیم شبلی بی کام

یہ نظم بلحاظ شاعری تسلسل اور قوتِ بیان کیٹس کی دُوسری نظموں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ اگر جان کیٹس اپنی ساری زندگی میں اس نظم کے سوا اور کچھ نہ لکھتا۔ تب بھی وہ انگلستان کے بہترین شاعروں میں سے ہوتا۔ اِس نظم کا اصل ماخذ ڈرائیڈن کی ایک کہانی ہے۔ لیکن کیٹس نے اِس کہانی میں کچھ تغیرات کئے ہیں۔ اس نے لیمیہ کو ایک قابلِ نفرت بدقماش جادوگرنی کی جگہ ایک آسمانی حُور کی صُورت میں پیش کیا ہے۔ جس نے ارضی محبّت کا لُطف اُٹھانے کے لئے انسان کا دھار ن لیا فلسفہ کی کہربائی طاقت کے سامنے لیمیہ کا دھواں بن کر رہ جانا پڑھنے والے کو اس بدنصیب ہستی کا ہمدرد بنا دیتا ہے۔ جان کیٹس نے ڈرائیڈن پر حقیقتاً ایک زبردست احسان کیا ہے۔ کہ اُس کے اِس غیر دلچسپ کردار میں محبّت اور ہمدردی کی رُوح پھُونک کر اُسے زندہ جاوید کر دیا ہے۔

جیسا کہ پچھلے اوراق میں عرض کیا گیا۔ جان کیٹس ایک مصوّر شاعر ہے لیمیہ میں اُس کی یہ خصوصیّت بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ جس خوبصورتی اور فنّی کمال سے کیٹس نے مختلف مناظر قلمبند کئے ہیں وہ یقیناً قابلِ مطالعہ ہیں ۰

حِصّۂ اوّل

ابھی پریوں نے جنگل کے دیوی دیوتاؤں کو سرسبز و شاداب جنگلوں سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اور نہ ہی اُوبراَن دیوتا جس کے خوف سے دریاد اور فانس رنگین پھلواڑیوں اور سرسبز جھاڑیوں کو خیرباد کہہ کر چلے گئے تھے۔ اپنے مطلاّ و مکلل تاج وعصا اور اپنی مرصّع و مسجّع قبا کے ساتھ سریر آرائے سلطنت ہوا تھا ــــــ اُن ایام کا ذکر ہے کہ عشق زدہ ہرمیز اپنے طلائی تخت سے اُترا۔ اور آنکھ چُرا کر باہر نکل جانے کی ٹھان لی ــــــ وہ آہستہ آہستہ دیوتاؤں کے بلند و بالا اولمپس سے بچ کر نکلا ــــــ دیوتائے اعظم کے بادلوں کی اُس طرف ــــــ تاکہ دیوتا کے قاصد کی عقابی نظروں سے اوجھل رہے ــــــ اور جزیرۂ تیرس کے ساحل پر ایک ہرے بھرے جنگل میں جا اُترا ــــــ !

اُس مقدس جزیرے میں ایک دوشیزہ جَل پری کا مسکن تھا۔ جس کے

سامنے تمام کھُروں والے ساتر ادوزانو ہوتے تھے۔ اور جس کے سیمیں قدموں پر بحری دیوتا ٹرائی ٹن لعل وجواہر نچھاور کرتے۔ اور زمین پر اس کی یاد میں مضطر و بدحال رہتے۔ اور اسی کے تصور میں آٹھوں پہر سرنگوں پائے جاتے تھے!

جزیرے میں چشمے کے قریب ہی جہاں یہ دوشیزہ پری غسل کرتی۔ اور جس سبزہ زار میں وہ گلگشت کے لئے جایا کرتی۔ زمین اکثر قیمتی تحائف سے لالہ زار رہتی تھی —— وہ ایسے گراں بہا تحائف تھے۔ جو کسی شاعر کی نظر سے بالا اور قوتِ ادراک کی حد سے یقیناً ماورئ تھے —— آہ محبت کے کتنے بے پایاں سمندر اس کے قدموں میں موجزن تھے ——!!

یہ خیال ہرمز کے دل میں آیا۔ اور اس پر ایک روحانی کیف چھا گیا۔ آتش عشق اس کے جسم میں سرتاپا سرایت کر گئی۔ اور اس کی سنہری زلفوں کے درمیان —— جو رقیبانہ انداز سے اس کے عُریاں شانوں پر بکھری رہتیں —— اس کے گلابی رخسار گل لالہ کی طرح سُرخ ہو گئے ——!

ہرمیز پَر پھیلائے جنگلوں اور وادیوں پر محوِ پرواز تھا۔ اور پھولوں پر اپنی نئی محبت کا اثر ڈالتا جاتا تھا۔ وہ بہت سے دریاؤں پر سے گزرتا ہوا ان کے منبع تک جا پہنچا —— اسی تلاش میں کہ شاید وہ دوشیزہ جل پری کہیں اُس کی

نظر پڑ جائے۔ لیکن یہ سب کچھ بے سُود تھا۔ اس کی پیاسی نظریں تشنہ کام ہی رہیں۔ اور وہ اُس کا دیدار نہ کر سکا؛

آخر وہ ایک سنسان جگہ پر آ کر ٹھیر گیا —— متفکر اور دیوتاؤں کے تکلیف دہ رشک سے مملو وہ وہاں کھڑا تھا۔ کہ اسے ایک دلخراش اور دلدوز آواز آئی۔ —— ایسی دلخراش آواز کہ ایک شقی القلب کا جگر بھی اُسے سُنکر پاش پاش ہو جاتا۔ اور اس کے دل میں محبت اور شفقت کی ایک مقدس لہر دوڑ جاتی —— وہ درد بھری آواز یہ کہہ رہی تھی ——

"آہ! مجھے اس مدوّر قبّے سے کب نجات حاصل ہو گی؟ اور کب میں ایک زندگی سے دھڑکتا ہوا جسم ہو کر زمین پر متحرک ہوں گی؟ اور کب میں محبت کے ساتھ دلوں اور لبوں کا خوش کن کھیل شروع کروں گی؟ ہائے افسوس ——!" آواز گونج کر رہ گئی؛

اس اثنا میں دیوتا ہرمیز کبک خرامی سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور اپنے مخملیں قدموں سے جھاڑیوں اور درختوں کو چھُو کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک حرکت کرتے ہوئے ناگ پر پڑی جو چمکتا دمکتا رات کی سیاہی میں کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا؛

وہ ناگ ایک پیچدار حلقہ بنائے خیرہ کن رنگوں سے چمک رہا تھا۔ اس کے شنگرفی، سنہری، سبز اور نیلے رنگ عجب بہار دکھا رہے تھے۔ گورخر کی طرح اس پر دھاریاں تھیں۔ چیتے کی طرح اُس کا داغدار جسم تھا۔ طاؤس کی طرح آنکھیں تھیں اس کے شفاف جسم پر سیمیں چندرما اس کے سانس کے ساتھ ساتھ ظاہر اور پنہاں ہوتے تھے۔ وہ سب رنگ مل کر ایسی بہار دیتے تھے۔ جیسے اُفق پر قوس قزح۔ لیکن ان رنگوں میں ایک غم کی ملاوٹ تھی۔ سانپ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک غمگین صورت پری یا کوئی عفریت کی مادہ یا خود عفریت ہی ہے۔

اُس کی کلغی قبس ابیض سے گندھی ہوئی تھی۔ جس پر تارے ٹکے تھے اور وہ ارباد نی کے ٹمکٹ کی طرح خوش نما تھی۔ اس کا سر سانپ کا سا تھا لیکن آہ اس کا چہرہ عورت ایسا تھا۔ اور اس کا منہ موتیوں ایسے سفید دانتوں سے چمک رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ــــ آہ، وہ حسین آنکھیں کس لئے بنی تھیں ؟ محض اپنے حسن پر آنسو بہانے کے لئے ــــ ان آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیلاب جاری تھا۔ جس طرح پرموزر پاٹین ملک سسلی کی یاد میں تڑپ رہی ہو۔ اُس کی گردن سانپ کی سی تھی۔ لیکن وہ شیریں نغمہ جو اس کے اندر سے اُٹھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی آبشارِ عسل سے پیدا ہو رہا ہے !

دیوتا ہرمیز اپنے پر تولے ایک شاہین کی طرح جو کسی شکار پر جھپٹ رہا ہو۔ کھڑا تھا۔

اتنے میں سانپ نے حرکت کی اور کہا :-

" خوبصورت دیوتا ! ہرمیز ! ! کلغی والے اور سرسراتے ہوئے پروں والے دیوتا ! ! ! میں نے کل رات تیرے متعلق ایک عظیم الشان خواب دیکھا تھا۔ میں نے تجھے ایک سنہری تخت پر بیٹھے ہوئے پایا۔ دیوتاؤں کے درمیان ــــ پرانے اولمپس کی چوٹیوں پر ــــ تجھے اُداس دیکھا۔ وہاں اکیلا تو ہی اُداس بیٹھا تھا۔ بلندیوں پر میوزز کی شہنائیوں سے ایک شیریں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اور اپالو کا مدہوش کن نغمہ ــــ آہ وہ طویل طویل غم انگیز نغمہ ــــ سُنائی دے رہا تھا۔ مگر تو غم کے سمندر ہی میں مستغرق رہا۔ پھر میں نے تجھے قرمزی لباس فاخرہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا۔ تو بادلوں میں چھُپتا۔ اور ظاہر ہوتا۔ سنہری پروں کے ساتھ محوِ پرواز تھا۔ بادلوں سے تو ایسے ظاہر ہوتا تھا۔ جیسے اُفق سے صبح نمودار ہوتی ہے۔ تو اپنے بازو پھیلائے فضا میں سورج کی کرن کی طرح تیزی سے سفر کر رہا تھا ــــ تو پوری تندہی سے قبرص کی طرف آ رہا تھا ــــ اور اب تو میرے سامنے موجود ہے۔ اے شریف دیوتا۔ کیا تو نے اپنی محبوبہ پا لی ؟"

اس بات کو سُنتے ہی بحرِ فراموشی کے موتی ہرمیز نے ذرا توقف نہ کیا۔ اور یوں زمزمہ پرواز ہوا۔

"اے نرم ہونٹوں والے موسیقی نواز افعی! تیرا خوبصورت کنڈل اور غم آلود نگاہیں ایک آسمانی برکت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ مانگ جو مجھ سے مانگتا ہے۔ لیکن اس کے بدلے مجھے صرف اتنا بتا دے۔ کہ میری دوشیزہ جل پری کہاں ہے؟ اور وہ کس جگہ اپنی نگہت پرور سانس سے فضا کو معطر کر رہی ہے؟"

افعی کے چہرے پر ایک سُرخی کی لہر دوڑ گئی اور بولا:۔

"اے چمکدار ستارے! تو نے کہہ تو دیا ہے۔ لیکن اے حسین دیوتا! اس وعدہ کو اپنی قسم سے پختہ کر۔"

ہرمیز نے کہا:۔

"اچھا میں اپنے جادو کے عصا کی قسم کھاتا ہوں اور تیری شعلہ زن آنکھوں کی اور تیرے منقش تاج کی" ——— اور اس کے پُرجوش الفاظ پھولوں کی لطیف خوشبو کے دوش پر خاموشی کے ساتھ پرواز کر گئے۔

پھر سانپ نے حرکت کی اور کہا:۔

"اے خواہشوں سے پُر دیوتا! تیری گم شدہ دوشیزہ باوجود غائب ہونے

کے ہوا کی طرح آزاد ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل ان بے خار جنگلوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ وہ بغیر جلوہ ریزی کے اپنے خوشگوار ایام گذار رہی ہے۔ شیریں پھولوں اور خوشنما پتوں پر اس کے ننھے ننھے پاؤں کے نشان دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ درختوں پر منڈھی ہوئی لمبی بیلوں اور ثمر دار جھکے ہوئے درختوں سے وہ غیر مرئی طور پر پھل توڑتی ہے۔ وہ چشموں پر اپنی زلفیں شانوں پر بکھیرے نہاتی ہے۔ مگر اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اور یہ میرا ہی جادو ہے کہ میں نے اس کے حسن کو مستور کر رکھا ہے۔ تاکہ وہ ساٹرز اور فانس کی نگاہوں سے جو حقیقی جذبہ سے تہی دامن ہیں محفوظ رہے۔ اور ساٹلی نس کی آہوں سے جن کے اندر حقیقی سوز و گداز کا نام نہیں وہ بچی رہے۔ ان تمام دیوتاؤں کی ہوس ناکی دیکھ کر اُس کی صورت پژمردہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس پر رحم کھایا اور اُسے کہا کہ وہ اپنے بالوں کو جادو کے پانی میں بھگو لے تاکہ اس کی خوبصورتی بدنظری سے اوجھل رہے۔ تاہم وہ آزاد ہے۔ اور جہاں چاہے پھر سکتی ہے۔ اے دیوتا تو اسے دیکھے گا اور صرف اکیلا تُو ہی اُس کے جلووں سے متمتع ہو سکے گا۔ بشرطیکہ تو اپنی قسم کے مطابق میری خواہش پوری کر دے۔"

ایک دفعہ پھر حسین دیوتا نے قسم کھائی۔ جو حقیقت اور صداقت سے لبریز تھی۔ اور جس میں ایک سوز جھلک رہا تھا۔

اس سچی سوگند سے متاثر ہو کر افعی نے اپنا چمکدار پھن اُٹھایا۔ اور ایک عجیب مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے کہا:۔

"میں ایک حسین ماہ وش عورت تھی۔ ایک دفعہ پھر مجھے عورت بنا دے ——— ہاں ایک پری پیکر خوبصورت عورت ——— اور مجھے قبرص کے ایک نوجوان سے محبت ہے۔ مجھے اس کے قریب پہنچا دے ——— دیوتا ہر میزاب نیچے جھک جا۔ تاکہ میں تیری مژگاں پر کچھ پھونکوں۔ اُس کی برکت سے تو ابھی اپنی دوشیزہ پری کو دیکھ لے گا ———!"

دیوتا اُسی لمحے اپنے پر سمیٹ کر نیچے جھکا۔ سانپ نے اس کی آنکھوں پر کچھ پھونکا۔ اور طرفۃ العین میں ایک دوشیزہ جل پری اُس کے پاس ہی سبزے پر کھڑی مسکرا رہی تھی ———!

یہ کوئی خواب نہ تھا یا شاید خواب ہی ہو ——— کیونکہ دیوتاؤں کے خواب بھی واقعیت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی غیر فانی خوابوں کی دُنیا میں

مسرور رہتے ہیں ———!

حدّتِ عشق سے بیقرار اور آتش محبت سے سوختہ وہ پہلے تو ایک لمحہ کے لئے اس جنگلی پری کے ارد گرد منڈلایا ——— اس کا سارا جسم دہک رہا تھا۔ پھر وہ ہرے بھرے گھاس پر جس کو تا حال پابوسی کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ آہستگی سے اُترا اور نیم خفتہ سانپ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پہلی مرتبہ اپنے قدسیہ کے طلسماتی عصا کی آزمائش کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھایا۔

بعد ازیں اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے پیہم ایسے اشک رواں تھے۔ جو دیوتا کی پرستش کے وقت عجز و گریہ کے سبب بے اختیار نکل آیا کرتے ہیں۔

وہ اُس کی طرف بڑھا لیکن وہ خزاں کے زرد۔ پیلے چاند کی طرح جب وہ تدریجاً گھٹ رہا ہو۔ ماند پڑ گئی۔ خوفزدہ ہو کر اس نے اپنی سسکیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اور وہ اس پھول کی مانند کملا کر رہ گئی۔ جو سر شام ہی مرجھا جاتا ہے۔

جب دیوتا نے پری کے ٹھنڈے ہاتھوں کو گرمایا۔ تو اس نے آہستہ

آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ جس طرح صبح صبح شہد کی مکھیوں کے والہانہ گیتوں کے اثر سے غنچے پھول بن جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ حور صفت اور ماہ وش پری بھی اپنی پوری رعنائی اور خوبصورتی کے ساتھ دیکھنے والوں کی شبستانِ کائنات کے لئے ماہ تاباں بن گئی۔

پھر وہ سبزہ زار جنگلوں کی خلوت گاہوں میں پرواز کر گئے۔ جہاں وہ انسانی مخلوق کی طرح کبھی زرد نہ پڑے۔ بلکہ اُن کے چہرے ہمیشہ خوشی اور مسرت کی وجہ سے دمکتے رہے ——!

جب ناگ اکیلا رہ گیا۔ تو اس پر فوری تغیرات ہونے لگے۔ اس کے خُوری خون میں جوش پیدا ہوگیا۔ اس کے مُنہ میں جھاگ آنے لگی۔ اور جب یہ زہریلی شبنم گھاس پر گرتی۔ تو وہ بھی کمُلا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں تکلیف کی وجہ سے پتھرا کر رہ گئیں۔ اور ان میں سے فاسفورس کی مانند شعلے بھڑک اُٹھے۔ کسی آنسو نے اُنہیں ٹھنڈا نہ کیا۔

اس کے جسم کے سارے رنگ شعلہ زن ہوگئے۔ شدّت کرب کی وجہ سے وہ تڑپنے اور پھڑکنے لگی۔ ایک گندھکی رنگ کے آتش گیر مادہ نے اس کے جسم پر بنے ہوئے چندرما کی جگہ لے لی۔ اور جس طرح ایک آتش فشاں پہاڑ

سبزہ زار کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اُس آتشگیر مادے نے اس کے سنہری گنبد اور مرمریں جلد کو پھونک کر رکھ دیا۔ اور اس کی دھاریوں۔ لکیروں اور داغوں کو خاکستر کر دیا۔ اس کے جسم پر جو ہلال بنے ہوئے تھے۔ ان میں گرہن لگا دیا۔ اور ستاروں کو بالکل فنا کر دیا۔

الغرض چند ہی لمحات میں وہ تمام لعل و یاقوت اور زمردوں سے محروم ہو گئی۔ اور اس کے جسم پر سوائے دُکھ اور تکلیف یا بدصورتی کے کچھ نہ رہا۔ اس کے سر پر ایک تاج چمک رہا تھا۔ لیکن وہ بھی غائب ہوگیا۔ اور وہ خود بھی اسی سُرعت کے ساتھ ناپید ہوگئی۔ اور اس کی آواز —— بانسری کی طرح سُریلی —— "لائی شمس۔ پیارے لائی شمس" —— مصفاکھر کے دوش پر اڑی۔ اور پہاڑیوں کے شور و غوغا میں جا کر گم ہوگئی۔ پھر قبرص کے جنگلوں نے اس کی آواز کو دوبارہ نہ سُنا۔

"لیمیہ" کہاں گئی؟ وہ جواب ایک خوبصورت دیوی تھی —— مکمل حسینہ نئی نویلی، بے مثال ——؟

وہ اس وادی میں اُڑ کر چلی آئی تھی۔ جو قرنطیہ اور ساحل سنشری کے درمیان مسافروں کو نظر آتی ہے۔ اور اُن جنگلی پہاڑوں کے دامن میں کھڑی تھی۔ جہاں

سے پیریَن کی ندیاں نکل کر بہتی ہیں۔ اور جن کی پُشت کی بنجر گھاٹیاں کلیونَ کے جنوب مغرب کی طرف جا نکلتی ہیں۔

وہ وہاں کھڑی تھی ـــــ جنگل سے قریب ہی ـــــ ایک سبزہ زار ڈھلوانی راستے پر، ایک شفاف تالاب کے کنارے اور اپنے آپ کو مصائب کے چنگل سے آزاد دیکھ کر نہایت مسرور تھی ـــــ اُس کی ساری بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں سے نیلوفر کے نازک پھُولوں کی طرح لہلہا رہی تھی ـــــ !

کتنا خوش نصیب تھا لائی شس !! کیونکہ وہ سب حسینوں میں سے زیادہ حسین تھی۔ کسی دوشیزہ کی اُس ایسی زلفیں نہ تھیں۔ اور نہ کسی ماہ وش نے اس کی ایسی آہوں سے فضا کو گرمایا تھا۔ نہ کسی کا چہرہ اس کے چہرے کی طرح عمیق حسیات سے ضو فگن ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی مہ جبین نے اُس کی مانند اپنے رقص و سرود سے کسی کو مسحور کیا تھا ـــــ وہ ایک دوشیزہ تھی۔ معصوم لبوں والی۔ تاہم دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے عشق کے جذبات میں ماہرِ تام۔ اگرچہ اُس کی عمرِ طبعی تا حال ایک ساعت ہوئی تھی۔ لیکن اُس کا دماغ حکیمانہ تھا۔ وہ خوشی کو غم سے الگ کر کے ان کی باقاعدہ حدود مقرر کر سکتی تھی۔ اور اُن کے ملے ہوئے اجزا کو جدا کر کے اُنہیں بسرعت کمال ایک دوسرے میں جذب ہو جانے سے بچا سکتی

تھی۔ اور وہ اُن کے بظاہر دلفریب اِدغام کو کمال چابکدستی سے علیحدہ علیحدہ کر کے ان کے پریشان ذرات کو مناسب طور پر ترکیب دے سکتی تھی ـــــ

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس نے عشق کے دیوتا کی درس گاہ میں رہ کر ایک ہونہار تلمیذ کی طرح خوشگوار ایام گذارے ہیں۔ اور وہاں سے اس نے مکمل تعلیم حاصل کی ہے۔ اِس کے باوجود وہ باعصمت تھی۔ اور اپنی "ارغوانی اصطلاحیں" اس نے کسی اور وقت کے لئے محفوظ رکھی ہوئی تھیں۔

اَب سوال یہ ہے۔ کہ اُس ماہ پارہ نے خاص طور پر یہ راستہ اپنے لئے کیوں منتخب کیا ـــــ ؟

ہم اِس سوال کے جواب کی ابھی تلاش کریں گے۔ لیکن پہلے یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ جب وہ افعی کے رُوپ میں تھی۔ تو وہ کس طرح اپنے جادو کے زور سے خیال آفرینیاں کیا کرتی۔ اور کس طرح وہ اپنی جگہ پر بیٹھی عالیشان حیرت افزا اور عجیب و غریب اشیا کے متعلق ذہن میں تصوّر باندھا کرتی تھی۔ اور جہاں وہ چاہتی۔ اس کی رُوح اس کے تصوّرات کے ہمراہ چلی جاتی تھی ـــــ !

روح آباد کی دھندلی دنیا میں یا اُن دلفریب لہروں کو پاٹ کر جن کے

دوش پر نیریؔد کی سنبلیں زلفیں پریشان ہوتی تھیں۔ وہ موتیوں کی سیڑھی سے اُتر کر تھیٹےؔ کی کٹیا میں دبے پاؤں چلی جایا کرتی یا اس بدمست دیودار کے نیچے جہاں بقوسؔ دیوتا جوشِ قدح سے اپنی بزم چراغاں کیا کرتا تھا۔ یا پیلاطوسؔ کے اُن باغات میں جہاں ہلتی بر کے تعمیر کردہ محلات اپنے متوازی ستونوں کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوتے تھے۔ بعض اوقات انسانوں کے شہروں میں وہ اپنی خوابیں بھیج دیا کرتی تھی۔ جہاں وہ عیش و عشرت کے شور و غل کے ساتھ ضم ہو کر رہ جاتیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ اسی طرح اپنے خیالات کے گھوڑے فانی انسانوں کی بستیوں میں دوڑا رہی تھی۔ کہ اسے قرنطیہؔ کا خوبرو نوجوان لائیؔ شس نظر پڑا —— وہ ایک حاسدانہ گھوڑ دوڑ میں اپنی رتھ کو سب سے آگے اُڑائے لئے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیوتائے اعظم کے چہرے کی طرح پُر سکون اور متین تھا ——!

اب اُس شام پرواتوں کے وقت لائی شس نے اس راہ سے گذرنا تھا۔ اور وہ خوب جانتی تھی۔ کہ وہ ساحل سے ہو کر قرنطیہ کی طرف جائے گا؛

مشرق کی طرف سے نسیم بحری چل رہی تھی۔ اور اس کی کشتی کا نسی سے منڈھا ہوا اگلا حصہ سنشریؔ کی بندرگاہ میں رتیلے ساحل سے ٹکرایا۔ وہ ایجیناؔ کے جزیرے سے آرہا تھا۔ جہاں وہ خدائے اعظم مشتریؔ کے آگے جس کا مندر اُس جزیرے میں اپنے مرمریں دروازوں کے ساتھ خون اور عنبریں خوشبوؤں کا منتظر ہے —— قربانی دیئے گیا ہوا تھا؛

دیوتا نے اس کی آہ و زاری سُنی۔ اور اس کی دعا قبول کی۔ اب وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا تھا۔ اور شاید ان کی قرنطیہ کے متعلق غیر دلچسپ باتوں سے تنگ آکر وہ تن تنہا محوِ خرام تھا ——!

سنسان پہاڑیوں پر وہ جا رہا تھا —— تہی دماغ —— لیکن نجمِ شب کے طلوع سے قبل وہ افلاطون کے اُس پیچیدہ اور اَدق فلسفہ کے سکون افزا شفق کے تصوّر میں مستغرق ہو گیا۔ جہاں عقل و خرد ناکارہ ہو جاتی ہے ——!

لیمیہ نے اُسے آتے دیکھا —— قریب اور لحظہ بہ لحظہ زیادہ قریب —— وہ آرہا تھا۔ لیکن بالکل لاپرواہانہ۔ اس کی بے آواز چپلیاں سرسبز گھاس پر پھسل رہی تھیں۔ وہ قریب ہی کھڑی تھی —— لیکن نظروں

سے اوجھل ـــــ وہ گزر گیا ـــــ اسرار ہیں بند ـــــ اس کے خیالات فلسفہ کے لبادہ میں لپٹے ہوئے ـــــ!

مگر اُس زہرہ جبین کی آنکھوں نے اُس کا تعاقب کیا ـــــ اِس نے اپنی ملکوتی گردن خم کی اور یوں ترنم ریز ہوئی ـــــ

"خوبصورت لائی تشس! اور کیا تم مجھے پہاڑوں پر ہی چھوڑ جاؤ گے؟ لائی تشس پیارے! مڑکر تو دیکھو!! اور خدا کے لئے کچھ رحم کرو!!!"

اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن حیرت خیز سرد آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ آرفیس کی طرح۔ جب اس نے یوری ڈائس کی طرف دیکھا تھا۔ کیونکہ ایسے میٹھے تھے وہ نغمے جو اُس نے الفاظ کی صورت گائے۔ کہ اسے محسوس ہوا۔ کہ وہ اُس آواز کو مدّتِ دراز سے پہچانتا ہے۔

جب لائی تشس نے اُس کی خوبصورتی اور رعنائی کا سیر ہو کر نظارہ کر لیا۔ حتیٰ کہ نشہ انگیز جام میں ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا ـــــ اگرچہ پیالہ پھر بھی لبریز تھا ـــــ تو اُس نے اِس خوف سے کہ وہ اُس کے خراجِ تحسین ادا کرنے سے پہلے ہی پرواز نہ کر جائے۔ یوں دادِ حُسن دینے کی کوشش

کی ـــــ

"میں تجھے اکیلا چھوڑ جاؤں؟ ـــــ آہ دیوی۔ اِدھر تو دیکھ! دیکھ کہ میری آنکھیں تو تیرے معبد سے ہٹتی ہی نہیں۔ خدا کے لئے میرے دل کو مایوس نہ کر۔ اگر تو نظروں سے غائب ہو گئی۔ تو میں یقیناً مر جاؤں گا ـــــ

ٹھہر جا۔ خواہ تو دریاؤں کی نیاد ہے ـــــ ٹھہر جا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ تیری ندیاں بہیں سے تیرے حکم کی تعمیل کریں گی ـــــ ٹھہر جا۔ خواہ تو جنگلوں کی ملکہ ہے ـــــ کوئی حرج نہیں۔ ٹھہر جا ـــــ تیرے درخت تیرے بغیر ہی شبنم کا پانی پی لیں گے۔ اگر تو پلیاد کی نسل سے ہے۔ تو بھی چنداں نقصان نہ ہوگا۔ تیری بہنیں تیرے کرۂ ارضی کو اپنی ہم آہنگی سے برقرار رکھیں گی۔ اور تیری جگہ اُن میں سے کوئی اور ضوفشاں ہو جائے گی ـــــ

آہ کس قدر شیریں نغموں میں تیرا سلام مجھے پہنچا۔ اگر تو غائب ہو گئی۔ تو میں صرف ایک سایہ بن کر ڈھل جاؤں گا ـــــ! خدا کے لئے میری نظروں سے غائب مت ہونا۔"

"اگر میں یہاں ٹھہروں ـــــ" وہ ماہ پیکر بولی ـــــ "اس مٹی کے بنے ہوئے فرش پر اور اپنے قدموں کو تکلیف پہنچاؤں۔ اِن پھولوں سے جو

میرے لئے کہیں زیادہ نا ملائم اور کھُردرے ہیں۔ تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم میرے دل سے میرے وطن کی خوشگوار یاد محو کرنے کے لئے کیا کرو گے؟ ـــــ تم مجھے یقیناً یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کہ میں تمہارے ساتھ ان وادیوں اور ان پہاڑیوں پر گامزن رہوں۔ جہاں کوئی مسرت اور کوئی خوشی نہیں ہے ـــــ ہاں جہاں بقا محض ایک خواب ہے۔ اور خوشی عنقا ـــــ

لائی شٹس! تم عقلمند آدمی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کہ غیر مرئی روحیں انسانی فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ نا سمجھ انسان! مجھے بتا تو کہ تیرے پاس میری رُوح کے مناسب حال کونسی فضا ہے۔ جس میں تو مجھے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کونسے محلات ہیں۔ جو تو مجھے دے گا؟ تاکہ میں وہاں اپنی ساری آرزوؤں کو پُورا کر سکوں۔ اور اسرارِ سربستہ کے ذریعہ سے اپنی ہزاروں خواہشوں کو تکمیل کی سیڑھی پر پہنچا سکوں ـــــ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اچھا خدا حافظ!!"

یہ کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل اُٹھی۔ اور اپنے سفید برّاق بازو پھیلا دیئے۔

لائی شٹس اس غم سے کہ اُس کا "حسین وعدہ" اُس سے چھین لیا گیا ہے۔ نیم بیہوش ہو کر گر پڑا ـــــ اور محبت کے متعلق گنگناتا ہوا وہ بے ہوش

ہو گیا۔ اور تکلیف سے زرد ـــــ!

اپنے نازک عاشق کی اس تکلیف پر اُس سنگدل ظالم عورت کو ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس کے برخلاف اگر اُس کی آنکھیں زیادہ روشن ہو سکتی تھیں۔ تو وہ ہو گئیں۔ اور ان چشم روشن اور دل شاد کے ساتھ اُس نے اپنے نئے نویلے کنوارے ہونٹ اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ اور اپنے پھندے میں پھنسی ہوئی "رُوح" کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ـــــ

اور جب وہ ایک بے ہوشی سے دوسری بے ہوشی میں منتقل ہو رہا تھا تو اس نے زندگی، محبت اور حُسن سے متاثر ہو کر ایک طرب انگیز ساز چھیڑا۔ ایسا ساز جو ارضی مغنیوں کے گانوں سے بھی کہیں زیادہ شیریں تھا ـــــ اور جسے سُننے کے لئے ستاروں نے بھی اپنی پھولی ہوئی سانس کی آگ کو ایک لمحے کے لئے تھام لیا ـــــ

پھر وہ ایک تھرتھراتی ہوئی نرم آواز میں اُس سے گویا ہوئی ـــــ جس طرح بچھڑے ہوئے دوست فراق کے تکلیف دہ ایام گذارنے کے بعد آپس میں ملتے ہیں۔ اور وہ کنجِ تنہائی میں بیٹھ کر نگاہوں کی بجائے سرگوشیوں سے عرض حال کیا کرتے ہیں ـــــ اس نے لائی شٹس کو اپنا سر اٹھانے

کے لئے کہا۔ اور اس کی رُوح کو شک وشبہ کی ملونی سے یہ کہہ کر منزّہ کیا۔ کہ وہ درحقیقت ایک عورت ہے۔ جس کی شریانوں میں لطیف خون کی بجائے دھڑکتا ہؤا خون بہہ رہا ہے۔ اور یہ کہ اس کے ستم رسیدہ دل کو بھی اُسی کی طرح چرکے لگ چکے ہیں۔ پھر اُس نے اس بات پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا۔ کہ اب تک اس کی آنکھیں قرنطیہ میں اُس کا دیدار کیوں نہ کر سکیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اس جگہ سے کنارہ کش رہتی تھی۔ اور اس نے وہاں کئی خوشگوار ایام بسر کئے تھے۔ لیکن اُس کی خوشی ویسی ہی تھی جیسی سونے کی مہروں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور جس میں عشق ومحبّت کی چاشنی مفقود ہوتی ہے۔ تاہم وینس کے مندر میں جب وہ اس کے قریب سے گذری تھی۔ ایک خوبصورت ستون کے ساتھ سہارا لئے اور خیالات میں مگن اس نے ایک دفعہ اسے دیکھا تھا۔ پھولوں اور پتیوں کی خوشنما سیجوں کے درمیان جن کو اسی رات نیا نیا کاٹا گیا تھا۔ کیونکہ وہ عدونیہ کی دعوت کی رات تھی۔ وہ کھڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اُسے کبھی نہ دیکھ سکی اور ہجر کے صدمے سہتی ہوئی وہ ان ایام میں رو تی رہی تھی۔

لائی شس اپنی "موت" سے بیدار ہؤا۔ اور اُسے تاحال وہیں ایک

دلفریب نغمہ گاتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر وہ حیرت واستعجاب کی حالت سے خوشی اور مسرّت کی حالت میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ ایک عورت کی طرح بول رہی تھی۔ اور ہر ہر لفظ جو اس نے منہ سے نکالا۔ اس پر ایک جادو کا اثر کر گیا۔ اور اُسے مسرّت جادواں کی دُنیا میں لے گیا۔

جنونی شاعروں کو پریوں، حوروں اور دیویوں کی مدح سرائی کرنے دو ——— مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ ان آبشاروں، جھیلوں اور غاروں کی رہنے والیوں میں اتنا لطف ہرگز نہیں ہے جتنا ایک اصلی عورت میں، جو پتّھر کے کنکروں سے پیدا ہوئی ہو یا جس کی ابتدا تخمِ آدم سے ہوئی ہو۔

چنانچہ لیمیہ نے اندازہ کیا۔ اور بالکل صحیح کیا۔ کہ لائی شس اُسے تہ دل سے محبت نہیں کر سکے گا۔ پس اُس نے دیویوں والے رعنائے پیرا لوازم کو علیحدہ کر کے ایک عورت کا رُوپ بھر لیا۔ اور اس طرح اس کا دل زیادہ احسن طریق سے موہ لیا۔ اب اُس کی شکل میں کوئی رعب نہ تھا۔ سوا اُس رعب کے جو خوبصورتی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اب اس نے ناوک افگنی تو اسی طرح کی لیکن ساتھ ہی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔

ان سب باتوں کا جواب لائی شس نے فصاحت وبلاغت کے

ساتھ دیا۔ اور ہر لفظ جو اس نے منہ سے نکالا۔ ایک آہ کے ساتھ ہم آہنگ تھا!

آخرکار اس نے قرنطیہ کی طرف اشارا کیا۔ اور اپنی محبوبہ سے پوچھا۔ کہ اگر اُس کے پاؤں اُس جگہ کے لئے زیادہ نازک نہ ہوں۔ تو کیا وہ اس کے ہمراہ چل سکتی ہے!

لیمیہ کے جادو کے زور سے وہ راستہ بالکل چھوٹا رہ گیا۔ حتیٰ کہ تین میل کا فاصلہ صرف چند قدم بن گیا۔ لیکن محبّت کے اندھے لائی شس کو یہ بات قطعاً محسوس نہ ہوئی۔ وہ سرتاپا محو تھا—— شہر کے دروازے بھی گذر گئے لیکن اُسے خبر نہ ہوئی۔ اور نہ ہی اُسے جاننے کا خیال آیا۔

جس طرح خوابوں میں انسان باتیں کرتے ہیں۔ قرنطیہ کا شہر اپنے شاہی محلات، پُر رونق بازاروں اور عیش و عشرت سے مدہوش مندروں کی موجودگی میں ایک دُور گڑگڑاتے ہوئے طوفان کی طرح شام کی سیاہی کے پردے میں گنگنا رہا تھا۔

عورتیں، مرد، امیر، غریب اس سہانے سماں میں چپلیاں پہنے سفید مرمریں فرش پر اکیلے یا کسی کے ہمراہ چہل قدمی کر رہے تھے—— اور

اِدھر اُدھر کئی روشنیاں دعوتوں کی وجہ سے جگمگا رہی تھیں۔ جن کی ضیا میں چلتے پھرتے یا کسی مکان کے سایہ میں یا کسی مندر کے دروازے پر یا کسی ستون کے نیچے انسان نظر آرہے تھے——!

دوستوں کے سلام کے ڈر سے اس نے اپنا منہ لپیٹا ہوا تھا۔ اور جب ایک شخص سفید لمبی ڈاڑھی والا اور تیز و تند آنکھوں اور پتھریلی چٹان کی طرح سفید "چاند" والا اس کے قریب سے گذرا۔ تو اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ چلنے والا فلاسفروں کی قبا پہنے اُس کے نزدیک آیا۔ تو وہ اور زیادہ اپنے لبادے میں سکڑ گیا۔ اور اپنے چلنے کی رفتار دُگنی کر دی۔

جب لیمیہ کو بھی اُس کے ساتھ تیز رفتار ہونا پڑا۔ تو وہ ڈر گئی۔ اور اس نے کہا——

"پیارے! خیر تو ہے۔ تم اس قدر تشویشناک انداز سے ڈر کیوں رہے ہو؟ تمہاری ہتیلی پر شبنم کا سا پسینہ کیوں آگیا ہے؟ میں تھک گئی ہوں مجھے جلد بتاؤ۔ کہ وہ بوڑھا کون تھا؟ مجھے اس کے خد و خال تو اچھی طرح یاد نہیں۔ لیکن لائی شس! تم اس کی بے پناہ آنکھوں سے شرما کیوں گئے؟

لائی شمس نے جواب دیا ———

"وہ اپولونیس فلاسفر تھا۔ میرا معتبر رہنما۔ ایک بہترین معلّم۔ لیکن آج تو وہ اہرمن کی اولاد کا کوئی عفریت معلوم ہوتا تھا۔ جس نے میرے سہانے خوابوں کو پریشان کر دیا ———!"

وہ یہ کہہ رہا تھا۔ کہ وہ ایک ستونوں والی ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ جس کا مدخل بڑا وسیع اور بلند تھا۔ باہر ایک سیمابی قمقمہ جگمگا رہا تھا۔ جس کی طلعت زا ہلکی روشنی مرمریں سیڑھیوں پر اس طرح منعکس ہو رہی تھی۔ جس طرح پانی میں ستارے لرزش پیدا کر رہے ہوں۔ سنگِ مرمر کا رنگ ایسا پاکیزہ اور مصفا تھا۔ کہ اس میں سنگ اسود کی سیاہ دھاریاں، شفاف سیّال مادے پر بکھرے دانوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ فرشتوں کے سوا کسی نے بھی اس جگہ بسیرا نہ کیا تھا۔ جونہی وسیع کواڑ کے کھلنے سے ایک خفیہ جگہ برآمد ہوئی وہاں سے عیوتین رہوا کی دیوی) کے ترنم کی ایک آواز نکلی۔

یہ مقام پوشیدہ تھا۔ اور اسے سوا دو پنجبہ دہن ایرانی غلاموں کے جو اسی سال بازاروں میں دیکھے گئے۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ اور نہ کسی کو علم تھا کہ وہاں کون رہتا ہے۔ بعض عجوبہ پسند لوگوں نے ان کا تعاقب بھی کیا تھا۔

لیکن وہ کھوج نکالنے میں ناکام رہے۔

اب کئی رجائیت پسند طبیعتیں چاہیں گی۔ کہ ان دونوں عاشقوں کو دنیا کے شور و غوغا سے دور اسی خفیہ جگہ میں چھوڑ دیا جائے ——— لیکن شاعری جو ہمیشہ حقیقت کی متلاشی رہتی ہے۔ اُس وقت تک دم نہ لے گی۔ جب تک اُس بھیانک منظر کا نقشہ نہ کھینچ لے۔ جو اُن کی تقدیر میں زمانہ قریب ہی میں لکھا ہوا تھا۔

حصّہ دوم

اے محبت کے دیوتا ——— کامدیو ——— ہمیں معاف کرنا۔ اگر ہم کہیں۔ کہ وہ محبت جو ایک جھونپڑے میں جہاں پانی اور سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کی جائے۔ محض فضول ہے۔ بے سود ہے، بے فائدہ ہے۔ لیکن وہ محبت جو ایک ایوان قصر میں کی جائے۔ غالباً کسی زاہد مرتاض کی ریاضت سے بھی زیادہ اندوہناک ہے۔ یہ پرستان کا ایک غیر مصدقہ اصول ہے۔ اور جسے عشق و محبت سے لگاؤ نہ ہو۔ وہ اسے سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا۔

اگر لائی شمس اپنی سرنوشت سنانے کے لئے زندہ رہتا۔ تو وہ اس

اخلاقی نظریہ کے ردّ و بدل میں ہرگز پس و پیش نہ کرتا۔ لیکن نفرت و حقارت کے جذبات جو محبت کی نرم آواز کو کرخت بنا دیتے ہیں —— پیدا کرنے کے لئے ان کی خوشی اور مسرت کا زمانہ بہت تھوڑا تھا۔ اور اس کے علاوہ عشق کا دیوتا ہر شب اپنی خوفناک چمک کے ساتھ ان کے کمرے کے دروازے پر حاسدانہ انداز میں منڈلاتا اور اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے ان کے کمرے کی چوکھٹ پر روشنی ڈالتا تھا۔ باوجود ان سب باتوں کے تباہی و بربادی کا زمانہ آ ہی گیا —— !

وہ ایک روز جھٹپٹے کے وقت صوفے پر بیٹھے تھے۔ جہاں روزمرّہ کے آرام نے اُن کے لئے اس نشست کو مانوس کر دیا تھا۔ وہ ایک منقش پردے کے نیچے بیٹھے تھے۔ جس کی ردا ہوا کی طرح مہین تھی۔ اور جو ایک سنہری تاگے سے لٹکا ہوا ہوا کے جھونکوں سے کمرے میں لہرا رہا تھا۔ باہر دو مرمریں ستونوں کے درمیان صاف و شفاف نیلگوں آسمان نظر آ رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں —— تاہم اس خیال سے کہ وہ سوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے جلوے سے بہرہ ور ہو سکیں۔ وہ نیم وا تھیں ——،

اچانک —— سامنے کی پہاڑی سے اُنہیں ایک طبلے کی آواز سنائی

دی۔ جس کی شور انگیز دھمک میں طیور کی نغمہ سرایاں بھی دب کر رہ گئیں —— !

لائی تشس چوکنا ہو گیا۔ آواز ماند پڑ گئی۔ لیکن اُس کے دماغ میں ایک سنسناہٹ چھوڑ گئی —— !

جب سے وہ اس پُر معصیت، خوشگوار گناہوں کی ارغوانی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ اس کی رُوحِ محبت کی زمردیں حدود سے نکل کر دنیا کی پُرشور آبادیوں میں آئی۔ جن کو وہ مدت سے خیرباد کہہ چکا تھا —— !

وہ عورت جو دُور اندیش اور رمز شناس تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اور اس نے خیال کیا۔ کہ لائی تشس کو شاید کسی مزید شے کی حاجت ہے۔ جو اس کی مسرت کا خزانہ اُسے مہیا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس لئے اُس نے بھانپ لیا۔ کہ لائی تشس اُس کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اور وہ جانتی تھی۔ کہ کسی غیر شے کا تصور کرنا اس کی محبت کی موت کا نقارہ ہے۔

لائی تشس نے آہستہ سے پوچھا:۔

"پیاری! تم آہیں کیوں بھر رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا:۔

"تو پھر تم سوچتے کیا تھے؟ —— تم نے مجھے ترک کر دیا —— اب میں

کہاں ہوں؟ تمہارے دل میں تو یقیناً نہیں ——— کیونکہ تمہاری مژگاں پر آزردگی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اور میں تمہارے دل سے تہی دامن۔ بے خانماں و برباد جا رہی ہوں۔ ہاں۔ ہاں! یہ ضرور ایسا ہی ہے ———!"

اس نے لیمتیہ کی روشن آنکھوں کے سامنے جھکتے ہوئے جہاں وہ اس ننھی سی فردوس گاہ کی مرأت میں منعکس ہو رہا تھا ——— یہ جواب دیا ———:

"میرے نقرئی ستارے۔ صبح کے بھی اور شام کے بھی ——— تم فرقت کے خیال میں اس قدر پژمردہ کیوں ہو رہی ہو۔ جبکہ میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ کس طرح میں اپنے دل کی دُنیا کو زیادہ گہری محبت سے جس میں اضطراب کی چاشنی بھی ہو آباد کر لوں۔ اور تمہاری روح کو اپنی رُوح کے ساتھ عشق کی مزید زنجیروں سے جکڑ لوں۔ پھانس لوں اور اسیر کر لوں۔ اور ایک ناشگفتہ کلی کی خوشبو کی طرح اپنے دل کی گہرائیوں میں اُسے محبوس کر لوں ——— ہاں ذرا مجھے اپنا بوسہ لینے دو ——— تم اپنے چہرے پر رنج کا اثر دیکھتی ہو؟

"میرے خیالات؟ کیا میں ان کا انکشاف کر دوں؟ تو پھر سنو۔ جب ایک انسان کے پاس کوئی بیش بہا خزانہ ہو اور وہ اس سے ایک عالم کو محوِ حیرت بنا سکتا ہو۔ تو اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ بازاروں میں اس چیز کو لیجا کر

اس کی تشہیر کرے ——— جیسا کہ میں کرنا چاہتا ہوں ——— اور میری آرزو ہے کہ تجھ کو ایک عروسی رتھ میں بٹھا کر قرطبہ کے پُر رونق بازاروں میں سے ہو کر گذر جاؤں۔ تاکہ جو میرے دوست ہیں۔ وہ مدح و توصیف کے گیت گائیں۔ اور جو دشمن ہیں۔ وہ آتشِ رقابت میں جل مریں ———!"

عورت کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ وہ بولی تو نہ لیکن پژمردہ خاطر ہو کر حلیمانہ انداز میں اُٹھی اور لائی شمس کے قدموں پر گر کر اشکوں کا ایک دریا بہا دیا۔ اور نہایت لجاجت سے اس کے آگے درخواست کی۔ کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے۔ (اس اثنا میں وہ اس کے ہاتھوں کو گرماتی رہی)

لائی شمس کو اس سے از حد صدمہ ہوا۔ لیکن اب اُسے ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ اور اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے اپنی تمام تر توتیں صرف کر دینے کا پُورا فیصلہ کر لیا۔ نیز باوجود اس بے پایاں محبّت کے جو وہ اپنی بہتر صنف کے بارہ میں اپنے دل میں جاگزیں کئے ہوئے تھا۔ وہ اس کے رنج و الم میں ایک قسم کا حظ محسوس کرتا تھا ——— اس کی خواہش اور بھی تیز ہو گئی۔ اور غیظ و غضب نے ایک ایسے آدمی کی ابروؤں پر جس کی جبیں پر کبھی کوئی شکن نہ پڑا تھا۔ ایک وحشیانہ رنگ

اختیار کر لیا۔

غصہ فرو کرتے وقت اس کا چہرہ اپالو کے چہرے کی طرح حسین ہو گیا۔ جب وہ ایک سانپ کو مار رہا تھا —— ہشت! سانپ؟ —— کہیں وہ سانپ تو نہیں تھی؟

اس کے جسم میں محبت کی آگ سلگ رہی تھی۔ اور وہ استبداد و تظلم کو پسند کرتی تھی ——!

چنانچہ جب یہ معاملہ دب گیا۔ تو وہ برات لانے پر رضامند ہو گئی ——!

رات کی خاموشیوں میں اس نوجوان نے یوں سرگوشی کی :۔

"تمہارا کوئی پیارا نام ہو گا۔ اگرچہ میں نے تمہیں ایک آسمانی روح تصور کرتے ہوئے جیسا کہ میں اب بھی کرتا ہوں۔ تم سے کبھی تمہارا نام دریافت نہیں کیا۔ لیکن کیا اس من موہنی صورت کا کوئی فانی نام بھی ہے اور کیا اس شادی خانہ آبادی پر مبارکباد دینے کے لئے تمہارا کوئی رشتہ دار یا دوست بھی ہیں؟"

لیمیہ نے افسردگی سے جواب دیا :۔

"میرا کوئی دوست نہیں —— ایک بھی نہیں —— قرنطیہ میں میری

موجودگی کا بمشکل کسی کو علم ہو گا۔ میرے والدین کی شکستہ استخواں مٹی میں مل چکی ہیں۔ اور ان کے مزاروں پر ایک شمع بھی روشن نہیں ہے۔ وہ اپنی بدنصیب قوم کا حال دیکھ کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ صرف میں ان کی بیٹی رہ گئی ہوں اور میں بھی تمہاری وجہ سے ان کی قبر پر ضروری رسومات بھی ادا نہیں کر سکتی جیسے تمہاری خواہش ہے۔ مہمانوں کو بلا لو۔ لیکن اب بھی اگر تم مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہتے ہو۔ تو اس بوڑھے اپلونیس کو مت بلانا —— اس سے مجھے پوشیدہ ہی رکھنا!"

لائی سئس یہ عجیب وغریب الفاظ سُنکر سخت حیران ہوا۔ اور اُس سے اس کی وجہ پوچھی۔ لیکن وہ گھبرا گئی۔ اور سونے کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اُسے بھی اپنے جادو کے زور سے نیند کے دھندلکوں میں غائب کر دیا ——،

اُس زمانے کی رسم تھی۔ کہ شفق کی گلکاریوں کے وقت دُلہن کو ایک پردے دار گاڑی میں بٹھا کر گھر لایا جاتا تھا۔ اس کے آگے پھولوں کی سیجیں بچھا دی جاتیں۔ اور شمع بردار شادی کے نغمے گاتے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور جشن منائے جاتے تھے :

لیکن اُس بچاری کا کوئی دوست نہ تھا جب وہ اکیلی رہ گئی۔ (کیونکہ لائی شمس اپنے رشتہ داروں کو بلاوا دینے گیا تھا) اور اس نے سمجھ لیا۔ کہ وہ لائی شمس کو اپنے احمقانہ ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی۔ تو وہ اس سوچ میں پڑ گئی۔ کہ اپنی آرائش کس طرح کرے۔ اور کیسے اپنی کبیدہ خاطری کے باوجود اس عظیم الشان جشن کو منانے کے لئے مناسب حال تیاریاں کرے؛

بعد میں اس نے یہ سب کچھ کیا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ اس کے خفیہ کارگزار کیسے اور کہاں سے آئے تھے؛

ہال کمرہ اور دروازوں کے اندر اور باہر پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اور چند ہی لمحوں میں حجلۂ عروسی مزیّن ہو کر آب و تاب سے چمکنے لگا۔ ایک سحر انگیز نغمہ جس پر تمام فسوں کاری کا انحصار تھا۔ کمرے کے اندر گونج رہا تھا۔ مبادا کہ وہ ساری سحر آفرینی بیک لحمہ ناپید ہو جائے؛

یہ نو بہ نو چوب کاری ایک وادئ دلفریب کی نقل تھی۔ جس میں انار اور کھجوروں کے درخت قطار اندر قطار لگے ہوئے تھے۔ دو دو انار اور دو دو کھجوروں کے درخت سڑک کے دونوں طرف سے آکر عین وسط میں

ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے تھے۔ جس کے زیر ایک پھولوں سے اَٹی ہوئی روش تھی۔ عشق پیچاں کی بیل بڑے درختوں کے ساتھ منڈھی ہوئی تھی۔ اور ان کے نیچے قمقموں کی ایک سیمابی رَو جگمگا رہی تھی۔ درختوں کے عین درمیان مرمریں بخوردانوں میں عود و عنبر جل رہا تھا۔ اور ایک منقّش شامیانے کے نیچے خوشبودار کھانے چنے تھے۔

لیمیہ لباس فاخرہ زیب تن کئے شباب کی صاعقہ پاشیاں کرتی ہوئی ادھر اُدھر مصروف تھی۔ وہ شگفتہ لیکن افسردگی کے عالم میں ڈوبی ہوئی اپنے نادیدہ کارکنوں کو عمارت کے کونے کونے اور چپّہ چپّہ کو سجانے اور مزیّن کرنے کی ہدایات کرتی پھرتی تھی؛

آخر اس نے سب کام پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور خود کمرے کو بند کر کے اس میں ساکت و صامت ہنگامہ پرداز مہمانوں کا انتظار کرنے لگی۔ جو تھوڑی دیر ہی میں آکر اس کی خاموشی میں مخل ہونے والے تھے۔

آخر وہ وقت آپہنچا۔ اور سب مہمان خوش گپیاں اُڑاتے آگئے؛

اے کوتاہ اندیش لائی شمس! دیوانے!! تجھے کیا سوجھا تھا۔ کہ تو اپنی قسمت کے خاموش لمحات کو دریا بُرد کرتے ہوئے اُن پوشیدہ آرام گاہوں

کی تشہیر کر رہا تھا ——— ؟

آنے والے مہمانوں کا دماغ معروف تھا۔ اُن میں سے ہر کوئی حیرت و استعجاب کے سمندر میں مستغرق دروازے میں انگشت بدنداں داخل ہوا۔ کیونکہ وہ اس بازار سے بچپن کے زمانے ہی سے آشنا تھے۔ اور اُنہیں علم تھا۔ کہ وہاں کوئی چٹیل میدان نہ تھا اور نہ کبھی اُنہوں نے اُس جگہ کوئی عالیشان عمدہ ساخت کی عمارت دیکھی تھی۔

تعجب خیز اور استفسار انگیز آنکھوں سے اس فسوں کاری کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ سب جلدی سے اندر داخل ہوئے۔ سوا ایک کے جو کڑی نگاہوں سے دیکھتا ہوا نپے تُلے قدموں کے ساتھ چل رہا تھا ——— !

یہ اپلونیس تھا۔ کسی چیز پر اُسے ہنسی آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ اور اس وجہ سے اُس کے دل کو سکون میسّر نہیں ہے۔

لیکن اب اس نے گتھی سلجھا لی تھی ——— یہ اُس کی پیش اندیشی کے عین مطابق تھا۔

وہ پُر شور طالار میں داخل ہوا۔ اور جا کر اپنے نوجوان شاگرد سے

ملاقات کی اور اس سے یوں گویا ہوا:۔

"لائی شس یہ وضعداری کے تو خلاف ہے۔ کہ ایک ناخواستہ مہمان یوں بے دھڑک یہاں گھس آئے۔ اور خوشرو نوجوان دوستوں کے زمرے میں نہایت بدتہذیبی سے آکر شامل ہو جائے۔ لیکن تاہم میں اس غلطی کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ اور تم مجھے معاف کرو گے"۔

لائی شس شرما گیا۔ اور عذر خواہی کرتا ہوا۔ اور بوڑھے کی ناراضی کو حلاوت آمیز باتوں سے فرو کرتا ہوا اُسے ایک وسیع چوپٹ دروازے میں سے اندر لے آیا ———،

حجلۂ عروسی بوقلموں رنگینیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور اس میں ایک عطر بیز نکہت بھری ہوئی تھی۔ بلوریں لگنوں میں عود و عنبر سلگ رہے تھے۔ جن میں سے شمیم زا معطر دھواں نکل رہا تھا۔ لگنوں کو چند مقدس تپائیاں تھامے ہوئے تھیں۔ جن کی مہین ٹانگیں خوشنما اونی قالینوں پر پھیلی ہوئی تھیں دھوئیں کے پچاس سُنبلیں حلقے پچاس ہی شمعدانوں میں سے اٹھ اٹھ کر سوئے سقف بلند رواں تھے۔ اور سامنے کے آئینوں میں انہی عنبر فشاں بادلوں کا دُہرا عکس لرزش کر رہا تھا۔ بارہ بیضوی میزیں جن کے بالمقابل انسانی

سینے کی بلندی تک بارہ ہی گول ارزق نشستیں تھیں۔ ایک فرنس کے چنگل پر
قرینہ سے منضبط تھیں۔ میزوں پر صدف کے بلوریں ساغروں میں مئے گلگوں چھلک
رہی تھی۔ اور سیرس کے سینگوں میں سما جانے والے اثمار سے بھی سہ گنا پھل
چنے تھے۔ اور قریب ہی بڑے بڑے میناؤں میں شوخ، چمکیلی شراب ناب
جو کسی میکدۂ عتیقہ سے لائی گئی تھی۔ دیکھنے والوں کی نظر نوازی کر رہی تھی۔
ان سب ماکولات و مشروبات کے درمیان دیوتاؤں کی ایک ایک مورتی بطور
زینت و زیارت کے رکھی ہوئی تھی۔

طالار میں ہر شخص کے ہاتھ پاؤں پر حسین بنچوں نے آبِ خنک کے اسپنج
نچوڑے اور ان کے بالوں میں خوشبودار تیل ڈالا۔ پھر سب کے سب کھانے کے
کمرے میں سفید لباس پہنے چلے گئے۔ اور اس دولت و امارت کے مبدأ و
ماخذ پر غور کرتے ہوئے حریری گدیلوں پر ترتیب وار بیٹھ گئے۔

ہوا میں نرم رَو موسیقی گونج رہی تھی۔ اور مہمان جب تک شراب نہ
ملی تھی، آہستہ آہستہ یونانی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔ لیکن جب خوشبودار
انگبیں نے ان کے دماغوں کو تر کیا۔ تو وہ بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔
اور اس کے ساتھ ہی موسیقی کی تانیں بھی زیادہ بھاری اور تیز ہو گئیں۔

وہ محل۔ ساز و سامان کی شان و شوکت۔ مرصع چھت۔ مئے گلگوں۔ حسین
غلمان اور لیمیہ خود (شراب کے خوشگوار اثر کے ماتحت جب انسان ہر بیڑی سے
آزاد ہو جاتا ہے) اب کوئی تعجب خیز چیزیں نہ رہیں۔ کیونکہ لذیذ اور دل پسند
شراب کے آگے جنتِ فردوس بھی کوئی اجنبی شئے نہیں رہتی ——!

اب ربۃ بقوس —— شراب —— اپنے عروج پر تھی۔ اُن کے رخسار
لالہ فام ہو گئے۔ اور ان کی چمکیلی آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہو گئیں۔
اس کے بعد ہر قسم کے ہار جو تمام وادیوں اور جنگلوں کے خوشبودار پھولوں
اور پودوں کی ٹہنیوں سے گندھے گئے تھے۔ لبالب بھری ہوئی ٹوکریوں
میں لائے گئے۔ تاکہ ہر مہمان اپنے خیالات اور اپنے مذاق کے مطابق ان
میں سے ایک کا اپنے لئے انتخاب کر سکے۔

لیمیہ کے لئے کونسا ہار ہو؟ اور لائی شس کے لئے کونسا؟ اور اس
بوڑھے فلاسفر اپلونیس کے لئے کونسا؟

لیمیہ کی دُھکتی پیشانی پر تو ہمارے خیال میں بید مجنوں کی پتیوں اور
ناگ بوٹی کا ہار ہو۔ اور اس نوجوان کے لئے انگور کی بیلوں کا۔ تاکہ اس کی
چوکنی آنکھوں میں اور زیادہ کیف و سکر چھا جائے۔ اور اس بوڑھے فلاسفر

کو تیز بھالے کی طرح نوکوں والی گھاس اور زہریلے اونٹ کٹارے کا گوندھا
ہوا ہار دینا چاہئے۔ تاکہ وہ اس کی کنپٹیوں پر جا کر جنگ آزمائی کرے۔

کیا روکھے فلسفہ کے سامنے تمام رعنائی عنقا نہیں ہو جاتی؟ آسمان پر
ایک زمانہ گذرا۔ قوس قزح کے نام سے ایک چیز تھی۔ اب ہم اُس کے اجزائے
ترکیبی اور ماخذ کو جانتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک عام شے بن کر رہ گئی ہے۔
فلسفہ تو فرشتوں کے پَر بھی کتر لیتا ہے۔ اور قوانین و ضوابط کی رُو سے فضا کو
جنّوں اور چڑیلوں سے پاک و صاف کیا جا سکتا ہے۔ اور ثریٰ نشین بھوتوں
کو چشمک برق میں کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح لیمیہ کا بھی تجزیہ
کر دیا گیا۔ اور وہ ایک لمحہ میں سایہ بن کر ڈھل گئی۔"

لائی شس لیمیہ کے قریب مسرور بیٹھا تھا۔ اور اس کا دھیان اپنی معشوقہ
کے سوا کمرے کی کسی اور صورت کی طرف نہ تھا۔

آخر اس نے اپنی محویت کے عالم کو توڑا۔ اور ایک لبالب جام اُٹھایا پھر
اس نے میز کی دوسری جانب نگاہ ڈالی۔ تاکہ اپنے اُستاد کی صحت کا جام نوش
کرے۔ کیا دیکھتا ہے کہ گنجی چندیا والے فلاسفر کی آنکھیں عروس کے حسن
خوفزدہ پر نہایت بے رحمی سے جمی ہوئی ہیں۔ اور وہ اس کی طرف متواتر

اور بلا توقف دیکھ رہا ہے۔"

لائی شس نے زور سے لیمیہ کا ہاتھ دبایا۔ لیکن وہ پیلی زرد ہو کر صوفے
پر نڈھال پڑی تھی۔ اس کا ہاتھ برف کی مانند سرد تھا۔ اور اس کی شریانوں
میں آب خنک رواں تھا۔ پھر فوراً ہی اس کا ہاتھ گرم ہو گیا۔ اور اس
غیر معمولی گرمی کی شدت لائی شس کے سینے میں آ کر گولی کی طرح لگی۔"

"لیمیہ یہ کیا بات ہے؟ ڈرتی کس سے ہو؟ کیا تم اس آدمی سے واقف
ہو؟"

لیمیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

لائی شس نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ لیکن
ان میں اس کی والہانہ محبّت کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے زیادہ غور کے
ساتھ دیکھا۔ اور متواتر دیکھتا چلا گیا۔ لیکن انسانی حواس لڑکھڑا گئے۔ کوئی
سحر حریص اس کے حسن کو چوس رہا تھا۔ اس کی پتلیوں میں قوتِ امتیاز
بھی مفقود ہو رہی تھی ——— !

"لیمیہ!" اس نے چیخ کر بلایا۔ لیکن جواباً کوئی نرم آواز نہ آئی۔ لوگوں
نے اس چیخ کو سُنا۔ اور عیش و عشرت کی آوازیں بند ہو گئیں کیٹی نازک

پتیاں ہاروں میں خشک ہوگئیں۔

آہستہ آہستہ انسانی آوازیں ۔موسیقی اور خوشی و مسرت کی تانیں سب بند ہوگئیں ۔ایک شہرِ خاموشاں کا سا بھیانک سکوت بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہاں ایک ہُو کا عالم طاری ہوگیا۔اور ہر شخص کے رونگٹے خوف کے مارے کھڑے ہونے لگے؛

"لیمیہ" لائی شس نے پھر چیخ کر بلایا۔لیکن سوا ایک بازگشت کے کوئی آواز اس بھیانک سکوت میں مخل نہ ہوئی۔

"دور ہوجا' اے فسوں کاری" لائی شس پھر چلایا۔اور لیمیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔لیکن وہاں اب کنپٹی پر کوئی نیلگوں رگ موجود نہ تھی نہ کوئی رخسار پر سرخی کی جھلک تھی اور نہ آنکھوں میں جو اب اندر دھنس گئی تھیں۔کوئی روشنی ہی تھی ـــــ آنکھیں بے نور ہوگئیں اور لیمیہ ایک بے جان لاشے کی صورت کرسی پر بیٹھی تھی۔

"بند کر' بند کر' اپنی سحر انگیز آنکھیں۔او بے رحم! دُور کر اُنہیں نابکار ورنہ اُن تمام دیوتاؤں کی لعنتیں جن کی مورتیاں یہاں ان کی ظلّی موجودگی کی آئینہ دار ہیں تجھ پر پڑیں گی۔اور تجھے نہایت ایذا رسانی کے ساتھ

اندھا کرتے ہوئے تیرے ضمیر کو اسقدر کمزور بنا دیں گی۔کہ تو حرماں نصیب ہوکر واصلِ جہنم ہوگا۔اور یہ سب کچھ بدلہ ہوگا تیری اُن کذب بیانیوں کا۔ تیری ناجائز سحر کاریوں کا اور تیری اُن فلسفہ بازیوں کا جو تو دیوتاؤں کی طاقت و جبروت کے علی الرغم اور ان کی ناراضی سے بے پروا ہوکر کرتا رہا ہے۔

"قرنطینو! اس بوڑھے بدمعاش کی طرف دیکھنا ـــــ دیکھنا کہ اُس کی آنکھوں کے اُوپر کس طرح اُس کی بے بال پلکیں تنی ہوئی ہیں"

"بے وقوف" فلاسفر نے ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ نرم آواز میں کہا۔جس کا جواب لائی شس نے ایک موت کی طرف قریب لے جانے والی کراہ کے ساتھ دیا۔اور خود بیہوش ہوکر لیمیہ کے جاں بلب جسم کے ساتھ جا گرا۔

"بے وقوف! بے وقوف!!" فلاسفر نے پھر دُہرایا۔اور اُس کی آنکھوں میں ابھی کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی تھی۔زندگی کے تمام دکھوں سے میں نے تجھے آج تک محفوظ رکھا۔اور کیا تجھے اب میں ایک سانپ کا شکار ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں؟"

لیمیہ نے موت کی آخری ہچکی لی۔

فلاسفر کی آنکھیں ـــــ نشتر کی طرح تیز، ظالم، متجسس اور زہریلی اُس کے جسم کے ریشہ ریشہ میں گھُس گئیں۔ لیمیہ نے حتی المقدور اپنے کمزور ہاتھ سے فلاسفر سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

لیکن وہ اپنی غیر متحرک آنکھوں سے بدستور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سانپ!" اس کی آواز کمرے میں گونجی۔

جونہی اس نے کہا۔ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ وہ غائب ہو گئی۔ اور ساتھ ہی لائی شس کا پہلو خوشی و مسرت سے خالی رہ گیا۔ وہ ایک بچھونے پر دراز تھا۔ اس کے دوست آئے۔ اُسے سہارا دیا۔ لیکن اس کی نبض ساقط تھی۔ اُس کا تنفس بند تھا۔ اور شادی کے لباس میں ایک بے جان جثہ وہاں پڑا ہوا تھا!

جامِ ریحان

احسان علی شاہ بی۔اے

کیٹس ایک محبّت کرنے والا دل لے کر پیدا ہوا تھا۔ اور اُسے ہر اُس ذی روح سے ہمدردی تھی۔ جس میں محبّت کرنے اور محبّت کے لئے اپنی ساری زندگی کو آنسوؤں میں بدل دینے کی صلاحیّت موجود ہو۔ ازابیلا بھی شدید محبّت کرنے والی عورت تھی۔ اور اس میں محبّت کے لئے سب کچھ کر گذرنے کا مادہ موجود تھا۔ کیٹس نے اِن تمام صفات کو بیک نظر دیکھ لیا۔ اور ان کے چاروں طرف تخیّل کا ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کر لیا۔ جو اس وجد آفریں نظم کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش ہوا۔

اس نظم کا اصل ماخذ بوکیشیو کی ایک کہانی ہے۔ کیٹس نے بوکیشیو کی ازابیلا میں اپنا دل رکھ دیا۔ اور اُسے حزن کی دیویؑ بنا دیا۔ مقتول عاشق کے لئے ازابیلا کا شدید غم بذاتِ خود ایک درد آفریں شعر کی حیثیت رکھتا تھا اس پر کیٹس کے فلک پیما تخیّل نے گلکاریاں کیں۔ اور محبّت کے اس نادر مجسّمہ کو اتنا جاذبِ نظر بنا دیا۔ کہ ہر دیکھنے والا اُس سے بے ساختہ ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جذبات کی شدّت۔ زورِ بیان اور رفعتِ تخیّل اس نظم کی قابلِ ذکر خصوصیات ہیں ۰

حسین اور سادہ دل ازابیلا اور عشق کے بیت المقدس کا ایک نوجوان راہب لورینزو ایک ہی حویلی میں رہ کر اپنے نازک دلوں کی پرکیف دھڑکنوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ جب تک اکٹھے کھانا نہ کھا لیتے۔ ان کے لئے دسترخوان پر بیٹھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے اس وقت تک نیند سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک ایک دوسرے کی یاد میں آنسو نہ بہا لیں ہر صبح بلند ہونے والا آفتاب ان کی محبّت کو پہلے سے دہ چند پاتا۔ اور شام کا پہلا ستارہ اس محبّت کو اور بھی گہرا اور پُرخلوص دیکھتا۔ لورینزو خواہ گھر میں ہو خواہ کھیتوں میں۔ ازبیلا کا پیارا سراپا ہر وقت اس کی آنکھوں تلے پھرتا رہتا۔ اور لورینزو کی پرکیف تانیں ازبیلا کے لئے درختوں کی ترنم آفرینیوں اور پُراسرار بانسری کی سمع نوازیوں سے کہیں زیادہ رُوح پرور اور کیف بار تھیں۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھول کر اس حسنِ مجسّم کو اپنی پیاسی آنکھوں کی آغوش میں لے لے۔ لورنیزو سمجھ جاتا تھا۔ کہ کس کا نرم و نازک ہاتھ دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ عقاب جیسی تیز نظروں سے اس کے چہرے کو کھڑکی میں دیکھ لیتا۔ اور جب وہ حسین چہرہ آسمان کی طرف اُٹھتا۔ تو وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ صبح کے وقت اس کے قدموں کی مترنم چاپ کو سیڑھیوں پر سننے کی بے قراری میں وہ تمام رات انگاروں پر لوٹتا رہتا۔

مئی کا طویل مہینہ اسی ذہنی انتشار میں گذر گیا۔ اور آغازِ جون نے ان کے حسین چہروں پر پژمردگی دیکھی۔ لورنیزو تکئے سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "کل میں اپنی مسرّت کے سامنے سجدہ کروں گا ——— کل میں اپنے دل کی مالکہ سے بھیک مانگوں گا۔" اور ازبیلا عالمِ خواب میں کہتی "لورنیزو! اگر تمہارے ہونٹ محبتٔ کا راگ نہ الاپیں۔ تو مجھے دوسری شام دیکھنی نصیب نہ ہو۔"

لیکن صد حیف کہ ان کے تلخ دن اسی طرح گذرتے گئے ——— یہاں تک کہ گلاب کے سائے میں رہنے کے باوجود ازبیلا کے شاداب رخسار مرجھا گئے۔ اور اس ماںتا کی ماری ماں کے گالوں کی طرح سوکھ گئے۔ جو میٹھی لوریوں میں اپنے بچے کے درد و کرب کا علاج ڈھونڈتی ہے۔ ازبیلا کتنی پژمردہ معلوم

ہوتی ہے۔" لورنیزو سوچتا۔ "مجھے کچھ کہنا تو نہ چاہیئے۔ لیکن میں سب کچھ کہوں گا اور صاف لفظوں میں اپنے دل کی رام کہانی کہوں گا۔ میں محبت کی ان غمناک آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ پی لوں گا۔ کم از کم اس سے اس کے دل کی الجھنیں دُور ہو جائیں گی۔"

ایک حسین صبح کو یہ خیال لورنیزو کے ذہن میں آیا۔ اور تمام دن اس کا دل بے پناہ شدّت سے دھڑکتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ کہ اسے بات کرنے کی طاقت مل جائے۔ لیکن اس کے باوجود سرخی کی لہر اس کا گلا دبا دیتی۔ اور اس کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ازبیلا کو بیوی بنانے کا بے باک تصور اسے بچے سے بھی زیادہ شرمیلا بنا دیتا۔ اُف! محبت کی طوفان انگیزیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔

ایک اور کرب انگیز رات کروٹیں بدل بدل کر گذر گئی۔ اور صبح کے وقت ازبیلا کی عقابی نگاہوں نے اس کی وسیع پیشانی کی گہری سلوٹوں میں رنج و غم کے ایک ایک نشان کو دیکھ لیا۔ پہلے وہ مردہ انسانوں کی طرح زرد معلوم ہوتا تھا۔ پھر ایک دم اس کا چہرہ شرم و حیا کی سُرخی سے مے گوں ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ازبیلا نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ "لورنیزو! اور پھر یہ طوفانی

جذبہ یکدم نسائی حجاب میں چھپ گیا۔ لیکن اس کا طرزِ تکلم اور اس کی نگاہیں وہ سب کچھ کہہ گئیں۔ جو اس کے دل میں تھا۔

"ازبیلا میں محسوس کرنے لگا ہوں۔ کہ میری دکھ بھری کہانی تمہارے کانوں تک پہنچنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اگر تم نے کبھی دنیا کی کسی چیز پر اعتماد کیا ہے۔ تو تمہیں اسی کا واسطہ! یقین جانو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میری رُوح آخری فیصلہ سننے کے لئے بیقرار ہے۔ میں تمہارے نازک ہاتھوں کو دبا کر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ اور نہ ہی ان مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سحر طراز نظروں کو خوفزدہ بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اور رات کاٹنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میرا جوشِ جنوں کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتا —— میری رُوح! تم مجھے سرما کی تلخیوں سے دُور لئے جا رہی ہو محترم خاتون! تمہاری موجودگی میرے ذہن میں احساس بہار کو زندہ کر دیتی ہے میں اس پھول کو سونگھ کر رہوں گا جس کی پنکھڑیاں کیف بار صبح کے آغوش میں کھلتی ہیں"۔ اس کے ہونٹ جو آج تک خاموش رہے تھے۔ بے باک ہو گئے۔ اور اس کے یاقوتی ہونٹوں سے ہم آہنگ ہو کر شعریت کی لطیف شبنم برسانے لگے۔ روحانی مسرت ان دونوں کی . . . ، جھکا ب تھی۔ اور انبساط

جون کے گرمجوش آغوش میں کھلنے والے پھول کی طرح بڑھ رہا تھا۔

جب وہ جُدا ہوئے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دو توام پھول چند لمحوں کے لئے جدا ہوئے ہیں۔ تاکہ پھر مل کر ایک دوسرے کی رُوحانی لطافتوں میں کھو جائیں۔ ازبیلا جو ربہ حسن کی طرح باوقار اور حسین معلوم ہوتی تھی۔ دلکش محبت اور اندھے دیوتا کے نغمے الاپتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور لورینزو خوشی سے ناچتا اور اچھلتا ہوا غروب آفتاب کی آخری کرنوں کو پہاڑیوں کے اردگرد طلائی ہار کی طرح لپٹا ہوا دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

جب شام کا دھندلکا ستاروں کے حسین چہروں پر سے نقاب اُٹھاتا۔ اس وقت یہ دونوں ملتے —— یہ دونوں سنبل اور سفید گلاب کے جھرمٹ میں دوسری دنیا اور بدنامی کی لرزتی ہوئی زبان سے بے پروا ہو کر ملتے۔ کاش یہ دن ہمیشہ کے لئے اسی طرف کیف بدوش رہتے۔ اور ان کی دکھ بھری کہانی دنیا کے احمقوں کے لئے اکتساب مسرت کا ذریعہ نہ بن جاتی!

تو کیا وہ رنجیدہ تھے؟ ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ان ہستیوں کے لئے جن کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہم آنسوؤں کے دریا بہا چکے ہیں۔ لاتعداد آہوں کا خراج دے چکے ہیں۔ ان کی موت کے

بعد ان پر نوحہ خوانی کی جا چکی ہے۔ اور ہزاروں حسرت انجام کہانیاں کئی کئی دفعہ دہرائی جا چکی ہیں۔

ازبیلا کی زندگی شدید مصائب سے لبریز تھی۔ اور لورینزو کی حنوط شدہ لاش درختوں کے حرارت ریز جھنڈ میں پڑی رہی تھی۔ پھر بھی یہ حقیقت بدستور قایم ہے کہ محبت کی سلطنت میں وقتی مسرت لاتعداد مصائب پر بھی حاوی آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شہد کی مکھیاں خدائے بہار کے دروازے کی بھکارنیں خوب سمجھتی ہیں کہ زہریلے پھول میں سب سے زیادہ شہد ہوتا ہے

یہ حسین دوشیزہ اپنے بھائیوں کے پاس رہتی تھی۔ جو باپ دادا کی بیشمار دولت کے مالک تھے۔ اور جن کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے جھریاں پڑے ہاتھ چراغوں کی روشنی سے منور کانوں اور کارخانوں میں آبلہ پوش ہو جاتے تھے۔ اور وہ رانیں جو گوشت کی وجہ سے تھرکتی رہتی تھیں۔ جانگداز کوڑوں سے خون بن کر بہ جاتیں —— ان کے لئے لاکھوں نیم مردہ انسان چمکتے ہوئے دریا میں صبح سے شام تک کھڑے رہتے اور زر و جواہر سے بھری ہوئی کشتیاں کنارے لگاتے رہتے۔

انہیں کے لئے سیلن کے ملاح نے اپنا سانس روک لیا۔ اور عریاں

جسم کے ساتھ بھوکی شارک کے منہ میں کود پڑا۔ انہیں کے لئے کمزور انسانی قومیں موت کے مہیب جبڑوں میں پس کر فنا ہو گئیں محض انہیں کے لئے لاتعداد انسان شدید مصائب کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اور یہ —— بے اعتنائی سے تقدیر کا پہیہ پھیر دیتے۔ جس سے مزدور کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا۔

وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ ان کے مرمریں فوارے ایک غم نصیب مسکین کی آنکھوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ قطرے لٹاتے تھے؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ نارنگی کی پہاڑیوں پر چڑھنا ایک کوڑھی کے سیڑھیوں پر چڑھنے سے زیادہ آسان تھا؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ سرخ لکیروں والے بہی کھاتے روما کے سنہری زمانے کی شاعری سے زیادہ وجد انگیز اور کیف بار تھے؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ امارت کی شوکت و سطوت کا صدقہ ہمیں بتاؤ کہ وہ کیوں مغرور تھے؟

فلارنس کے یہ دونوں فرزندان ڈوکٹر یہودیوں کی طرح مغرور اور خود پسند ہو گئے تھے۔ جو اس سرزمین شعر و رومان میں رہنے کے باوجود چاندی سونے میں گھرا رہنے کی وجہ سے زرد رو ہو گئے تھے۔ اور جو فقرا کو جاسوس سمجھ کر ان سے

ڈر جایا کرتے تھے۔

بہی کھاتے کے خشک اوراق میں ڈوبے ہوئے ایسے غیر شاعر لوگوں نے کس طرح حسین ازبیلا کو شفق کی رنگین دنیا میں دیکھ لیا۔ کیونکہ وہ لورینزو کی نظروں میں کام سے جی چرانے کا جذبہ بھانپ گئے۔ کس طرح مصر کا یہ گرم مزاج فرزند کاہل اور سست نظر آنے لگا؟ تاہم وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ تجار بھی کبھی کبھی شکار شدہ ہرن کی طرح پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ہے۔

جب ہزاروں اشاروں سے ان لوگوں کو لورینزو کی محبت کا یقین ہو گیا اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ ان کی بہن بھی اسے محبت کرتی ہے۔ تو ان دونوں نے ایک دوسرے سے اپنے خوفناک خیالات کا اظہار شروع کر دیا آخر لورینزو ان کا غلام کس طرح ان کی ہمشیرہ سے محبت کی رنگ رلیوں میں مشغول رہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ ازبیلا کسی نواب کی بیوی بنے۔ اور اس کی وساطت سے اس نواب کے زیتون کے درختوں سے فائدہ اٹھانے کی سبیل نکل آئے۔

جب وہ اکٹھے بیٹھتے تو ان کے حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں۔ جب وہ تنہا ہوتے تو ہونٹ چباتے رہتے۔ آخر کچھ دنوں کے غور و فکر کے بعد انہوں

نے ایک تجویز سوچ لی۔ جس سے اس بے وقوف نوجوان کو اسکی غلطی کی سزا دینے کا راستہ پیدا ہو گیا۔ مٹی کے ان سفاک پتلوں نے رحم و کرم کے جگر میں آتشیں خنجر بھونک دیئے۔ یعنی انہوں نے لورینزو کو قتل کر کے کسی گھنے اور تاریک جنگل کی ناقابلِ عبور گہرائیوں میں دفن کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ایک خوشگوار صبح کو جب لورینزو باغ کے پل پر جھکا ہوا آفتاب کی اچھوتی کرنوں میں نہا رہا تھا۔ یہ لوگ شبنم کو اپنے سفاک پاؤں تلے روندتے ہوئے اسکی طرف بڑھے اور بولے۔ "ہمیں افسوس ہے۔ کہ ہم تمہارے اس سکون میں مخل ہوتے ہیں۔ لیکن عقلمندی اسی میں ہے۔ کہ ایسے ٹھنڈے وقت میں گھوڑے پر زین کس لیجائے — آج — نہیں — اسی وقت ہم اپینائن کی طرف جائینگے۔ اس لئے اس سے پہلے کہ شبنم کے یہ بکھرے ہوئے موتی آفتاب کے طلائی دامن میں سمٹ جائیں۔ نیچے اُتر آؤ۔"

لورینزو نے حسب عادت بڑی خندہ پیشانی سے ناگن کے ان زہریلے بچوں کا استقبال کیا۔ اور جلدی جلدی پیٹی، نیزہ اور شکار کے دیگر سامان سے مسلح ہونے کے لئے اندر چلا گیا۔

صحن میں سے گزرتے وقت وہ ہر قدم پر ٹھہرتا۔ تاکہ اگر اسکے دل کی ملکہ

مصروفِ نغمہ طرازی ہو تو مترنم آواز اس کی سماعت میں محفوظ ہو جائے یا کم از کم ان ہلکے قدموں کی چاپ سُنائی دیدے۔ وہ اسی طرح اپنے جذبات کی فضاؤں میں اڑتا ہؤا جا رہا تھا کہ اُوپر کی منزل میں ایک نقرئی قہقہہ گونجا —— ایک ترنم ریز موسیقی زا قہقہہ! اس نے اوپر دیکھا۔ ازبیلا کا دمکتا ہؤا چہرہ اپنے عفت مآب دامن میں مسکراہٹوں کی جنتیں سمیٹے دریچے کے رخنے میں سے جھانک رہا تھا۔

"پیاری ازبیلا!" اس نے کہا۔ "مجھے خوف تھا کہ کہیں تمہیں صبح بخیر کہنے کی سعادت سے بھی محروم نہ کر دیا جاؤں۔ آہ! اگر تین گھنٹوں کے قلیل وقفے کی جدائی قلب وجگر کو غم و اضطرار کی چکی میں پیس سکتی ہے۔ تو تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا کسقدر جانسوز ہوگا۔ لیکن فکر مت کرو۔ ہم بھی روزِ روشن کی طرح جدائی کی بھیانک تاریکیوں میں نہا کر اور زیادہ نورانی ہو جائیں گے۔ خدا حافظ پیاری میں جلد آجاؤں گا۔"

ازبیلا نے کہا۔ "خدا حافظ۔" اور جب لورینزو جانے کے لئے مڑا۔ تو ازبیلا کے ہونٹوں پر ایک وجد آور نغمہ متحرک رہا تھا۔

اس طرح دونوں بھائی اور بدنصیب محب فلارنس کی حسین وادیوں میں سے ہوتے ہوئے اس طرف چل دیئے۔ جہاں آرنو ندی اپنی اٹھکیلیوں

سے ترنم کے دریا بہاتی لہروں کی مقراض سے کائی کو کاٹتی سبزے کناروں میں سے ہوتی ہوئی گذرتی ہے۔ دونوں بھائیوں کے گھبرائے ہوئے چہرے یکسر زرد ہو گئے تھے۔ لیکن لورینزو کے چہرے پر پاک محبت کا لافانی نور کھیل رہا تھا۔ وہ اس ندی پر سے گذر کر ایک بھیانک جنگل میں پہنچ گئے۔ جس کی ہمہ گیر خاموشی خوفناک کارروائیوں کے لئے موزوں ترین تھی۔

اسی جگہ لورینزو کو قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ آہ! اس جنگل کی تاریک وسعتوں میں محبت کے ایک عظیم الشان شعلے کو بجھا دیا گیا۔ افسوس! جب رُوح اس طریقے سے عناصر کی قید سے آزاد کر دی جائے۔ تو وہ گناہ کے شکاری کتے کی طرح بے قرار ہو جاتی ہے۔ ان قاتلوں نے اپنی تلواروں کو ندی کے پانی سے دھو لیا۔ اور گھوڑوں کے پہلوؤں کو اپنی گھبرائی ہوئی ایڑوں سے زخمی کرتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے دونوں قتل کے نشے میں سرشار تھے۔

گھر پہنچ کر اُنہوں نے اپنی بہن کو بتایا۔ کہ لورینزو کو کسی ضروری کام کی وجہ سے یکایک جہاز پر سوار ہو کر غیر ممالک میں جانا پڑا ہے۔ بدنصیب لڑکی بیوگی کا لباس پہن لے۔ اور خدائے امید کے بے درد پنجوں سے دُور بھاگ جا۔ آج تو اسے نہ دیکھ سکے گی اور نہ کل۔ وہ تیری طرف دیکھ کر مسکرائے گا اور پرسوں کا دن تیرے لئے

آنسوؤں اور سسکیوں کا دن ہوگا۔

وہ اس خوشی کے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ جو اسے کبھی بھی حاصل نہ ہوگی۔ وہ روتی رہی۔ یہاں تک کہ شام کے دھندلکے نے دنیا کو اپنے سائے میں لے لیا۔ اور پھر — آہ! وہ محبت کے پھولوں پر سونے کی بجائے قراطائی دولت کے طلائی کانٹوں پر تڑپتی رہی۔

اس کی نگاہیں شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں اپنے محب کا سراپا دیکھتی رہیں۔۔۔ بار بار ایک ہلکی آہ اس کے ہونٹوں تک آکر دم توڑ دیتی۔ وہ اپنے حسین اور متناسب بازو ہوا میں پھیلاتی اور اپنے بستر پر لیٹ کر زیر لب کہتی "کہاں ہو آہ کہاں ہو؟"

جس طرح خزاں کے وسطی زمانے میں دور سے سرما کی خوفناک پھنکاریں سنائی دینے لگتی ہیں اور دلگیر مشرق سنہری تاروں سے ایک مسلسل کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور جھاڑیوں اور پتوں میں موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے۔ تاکہ اپنے مشرقی غار سے نکلنے سے پہلے عریاں ہو جائے۔ اسی طرح حسین ازبیلا آہستہ آہستہ حسن کی بلندیوں سے گرتی گئی۔

کیونکہ لورنیزو واپس نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی زرد آنکھوں کو قابو میں

رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے بھائیوں سے پوچھتی۔ کہ لورنیزو کو کونسا ایسا کام تھا جس نے اسے اتنی دیر تک غیر ملک میں روک رکھا ہے۔ اور وہ اسے خاموش کرنے کے لئے ایک فرضی قصہ سنا دیتے۔ لیکن ان کا تاریک گناہ کثیف دھوئیں کی طرح ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط ہو چکا تھا۔ اور وہ رات کو سوتے وقت اپنی بہن کو برفانی کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر چیخ اٹھتے۔

وہ اس نشہ آور بے خودی سے مر گئی ہوتی۔ لیکن ظالم تقدیر نے اسے دنیا کی خوفناک ترین چیز کے دیکھنے کے لئے زندہ رکھا۔ یہ چیز اس دوا کے ایک ایسے گھونٹ کی طرح تھی۔ جو موت کی سسکیاں لیتے ہوئے بیمار کو چند لمحوں کے بعد کفن کی خوفناک چادر میں لپیٹ لے۔۔۔ ایک بیدرو بھالے کی طرح جو دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں سوتے ہوئے "ریڈ انڈین" کو ایک بے پناہ چبھن کے ساتھ بیدار کر دے۔ اور اسے ذہنی کرب کا احساس کرا دے۔

یہ ایک خواب تھا — آدھی رات کی بھیانک تاریکیوں میں اس نے دیکھا۔ کہ لورنیزو اسکی چارپائی کی پائنتی پر کھڑا ہے۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا لگ رہی ہے۔ جنگلی قبر کی خوفناک افسردگی نے اس کے بالوں کی وہ چمک دمک چھین لی تھی۔ جو کبھی سورج کی آنکھ کو منور کر دیتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر

موت کی سرد مہر ثبت ہو چکی تھی۔ اس کی آواز کا ترنم لٹ گیا تھا۔ اور اس کے خوبصورت گوشوارے آنسوؤں کی وجہ سے دلدل معلوم ہونے لگے تھے۔

جب زرد افسردہ سائے نے بولنے کے لئے زبان کھولی۔ تو ازبیلا کو اس کی آواز میں اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ اسکی رقت خیز آواز زندگی کی روانی اور مٹھاس کو واپس لانے کی بے سود کوشش میں مصروف تھی۔ ازبیلا اس آواز کے ترنم کو دوبارہ سننا چاہتی تھی۔ اس آواز میں رعشہ زدہ ڈردو کے بربط کے شکستہ تاروں کی دردانگیز کپکپاہٹ پنہاں تھی۔ اس میں سے ایک بڑا ہی دھیما ترنم سنائی دیا۔ جو آدھی رات کے وقت آتش فشاں پہاڑ کے شعلوں میں سے گذرنے والے تیز ہوا کے جھونکوں کی آواز سے مشابہ تھا۔

اس کی آنکھیں اگرچہ دہشت ناک تھیں۔ تاہم ان میں محبت کی چمک ابھی تک مستور تھی۔ اسی سحر آفریں چمک نے اس ننھی بدنصیب لڑکی کو خوف و ہراس کے پنجوں سے بچا لیا۔ لورنیزو کی روح تاریک ماضی پر سے خوفناک پردے اُٹھاتی رہی۔ غرور و نخوت کے قاتلانہ عزائم جنگل کی تاریک چھت ـــــ اور مٹی کی سرد غار ـــــ جہاں اس نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے آپ کو خونی برچھوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اس نے یہ بھی کہا "میری پیاری ازبیلا! میرے سرہانے سرخ جنگلی بیر ہیں اور میری پائنتی پر بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ میرے اردگرد چیٹنٹوں کے درخت سوکھے پتوں اور خاردار پھلوں کی بارش کرتے ہیں۔ بھیڑوں کے ریوڑ کی آواز دریا کے اس پار سے میری آرامگاہ تک آتی ہے۔ آؤ اور میری سونی قبر پر ایک آنسو بہا جاؤ۔ تمہارا یہ آنسو میری موت کی ساری تلخیاں دور کر دے گا۔

"اب میں ایک سایہ بن گیا ہوں۔ افسوس افسوس! اور انسانی فطرت کے بعید ترین گوشوں میں تنہا ہوں۔ میرے اردگرد زندہ انسانوں کی دھیمی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور میں تنہا مقدس گیت گاتا ہوں۔ شہد کی چمکدار مکھیاں بھنبھناتی ہوئی مرغزاروں کی طرف جاتی ہیں۔ اور بیشمار گرجوں کی مترنم آوازیں زندگی کی یاد کو تازہ کر کے میرے سینے میں بھالے بھونک دیتی ہیں۔ اب یہ سب آوازیں میرے لئے غیر مانوس ہو جاتی ہیں۔ اور تم مجھ سے بہت دور زندگی کی رنگین وادیوں میں بستی ہو۔

میں جانتا ہوں۔ کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ اور حال بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اگر روحیں غصے سے دیوانی ہو سکتی ہیں۔ تو میں بھی بہت جلد پاگل ہو جاؤں گا۔ باوجودیکہ میں زندگی کے لذائذ کو بھولتا جا رہا ہوں۔ تاہم تمہارے چہرے

کی یہ افسردگی میری قبر کو اس طرح منوّر کر دیتی ہے۔ گویا نورانی سمندر کا کوئی طلسمی ہیرا میرے پاس ہو۔ تمہارے چہرے کی زردی میرے دل و دماغ کو مسرّت کے لافانی نور سے بھر دیتی ہے۔ تمہارا حُسن میری رگ رگ پر مسلّط ہو جاتا ہے۔ اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ کہ محبت فولادی بھالوں کی طرح میری رُوح میں پیوست ہوئی جاتی ہے۔"

رُوح نے ایک دلدوز آہ بھر کر کہا۔ "الوداع" جس طرح پُر از آلام زمانہ اور سعیٔ نامشکور کا خیال ہماری جوانی کی راتوں سے نیند چھین کر ہمیں موسیقی کے زیر و بم میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور پر کیف دھندلکا پیچ و تاب کھانے لگتا ہے۔ اسی طرح روح بھی تحلیل ہو گئی۔ اور تاریک فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش چھوڑ غائب ہو گئی۔ مغموم ازبیلا کی آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ اور وہ پو پھٹے تک تارے گنتی رہی۔

"ہاہا" اس نے کہا۔ "میں زندگی کے ان شدائد سے ناآشنا تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ دنیا کا سب سے بڑا دکھ معمولی سی خلش سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتی تھی کہ قسّامِ ازل نے کسی خوشی کے وقت یا اپنی مخالف قوتوں سے لڑتے وقت جوش میں آ کر ہم دونوں کو مسرّت کا بہترین حصہ بخشا ہے۔ لیکن

مجھے اب معلوم ہوا ہے۔ کہ اس دنیا میں جرائم بھی ہیں۔ ایک بھائی کا خونچکاں خنجر بھی ہے۔ اے عزیز روح! تم نے میری معصومیت کو چالاکی میں بدل دیا ہے۔ میں آؤں گی تمہاری آنکھوں پر بے شمار بوسوں کی بارش کروں گی۔ اور صبح شام آسمان کی بلندیوں پر تیرا استقبال کیا کروں گی۔"

پو پھٹنے سے پہلے اس نے پوشیدہ طور پر اسی جنگل میں جانے کا طریقہ سوچ لیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا۔ کہ کس طرح وہ عزیز ترین مٹی ڈھونڈ لے گی۔ ان ذرّوں کو کس طرح میٹھی لوریاں سنائے گی۔ اور پھر جب اس خواب کی تعبیر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔ تو کیونکہ۔ اسکی یہ مختصر غیر حاضری معاف کر دی جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بوڑھی آیا کو ساتھ لیا۔ اور اس گھنے تاریک جنگل کی طرف چل دی۔

دیکھئے وہ ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے کس طرح بوڑھیا کے کانوں میں ہولے ہولے باتیں کرتی ہے۔ اور پھر کس طرح سہمی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھ کر اسے ایک خنجر دکھاتی ہے۔ "بیٹا یہ کیسا کافرانہ شعلہ تیرے سینے میں بھڑک رہا ہے ــــــ یہ تمہارا بار بار مسکرانا کیسی خوشی کا آئینہ دار ہے" شام تک انہوں نے لورینزو کی خاکی آرامگاہ کو ڈھونڈ نکالا۔ پتھر کے ٹکڑے بھی

وہیں تھے اور سرخ جنگلی بیر بھی!

کون ایسا متنفس ہے جو سرسبز قبرستان میں نہیں گیا۔ اور جس کا تصور ایک عظیم الجثہ چھچھوندر کی طرح مٹی کے ڈھیروں اور سنگین پردوں میں سے گذرتا ہوا کھوپری کی سوختہ استخوان اور کفن میں لپٹی ہوئی گلی سڑی ہڈیوں کو دیکھنے کے لئے قبر کے اندر نہیں پہنچا۔ اور پھر موت کے منحوس سائے تلے آکر بگڑی ہوئی صورتوں کو ترحم خیز نظروں سے دیکھ کر انہیں دوبارہ زندگی و روح سے آشنا کرنے کے لئے بے چین نہیں ہو گیا۔ لیکن یہ سب بے چینی اور حسرت اس جذبہ کرب کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ جو ازبیلا نے لورنیزو کے قریب دوزانو ہوتے وقت محسوس کیا۔

اس نے تازہ کھدی ہوئی مٹی کی طرف دیکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک ہی نظر میں سارے راز طشت از بام ہو گئے ہیں۔ جس طرح نگاہیں کنوئیں کے شفاف پانی کی تہ میں سب کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ اسی طرح ازبیلا نے بھی قبر کی گہرائیوں میں دبے ہوئے زرد اعضا کو صاف دیکھ لیا۔ وہ اس خونی مقام پر کھڑی ہوئی کسی خشک جھیل کا مرجھایا ہوا کنول نظر آتی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے کھڑی رہی۔ پھر دفعتاً جھکی اور بے پناہ سرعت سے زمین کھودنے لگی۔

جلد ہی اس مٹی میں سے ایک دھبہ دار دستانہ برآمد ہوا۔ جس پر ازبیلا کے

اپنے ہاتھوں سے سرخ ڈورے سے مختلف نقوش کڑھے ہوئے تھے۔ ازبیلا نے سنگ مر سے زیادہ سرد ہونٹوں کے ساتھ اسے چوم کر اپنے سینے کے پاس رکھ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچے کو بہلانے کا یہ معمولی کھلونا اب سرد ہو کر ہڈیوں میں جم گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ازبیلا اپنے کام میں مشغول رہی۔ اور بکھری ہوئی زلفوں کو ماتھے پر سے ہٹانے کے سوا وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ رکی۔

بوڑھی آیا دیر تک قریب کھڑی دیکھتی رہی۔ آخر اس کا دل اس روح خراش منظر کو دیکھ دیکھ کر پانی پانی ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنے برف جیسے سفید بالوں کے ساتھ جھک کر اس دہشت زا کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ آخر تین گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد قبر کا نچلا حصہ برآمد ہوا۔ کس قدر خوفناک منظر تھا! لیکن ازبیلا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی آنسو نہیں تھا۔

سر بین کی تلوار سے بھی زیادہ کند آلے کے ساتھ ان لوگوں نے کسی غیر انسانی مخلوق کا سر نہیں کاٹا تھا۔ بلکہ یہ سر تھا۔ ایک ایسے شخص کا جو موت کے بعد بھی اسی طرح حلیم الطبع معلوم ہو رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی میں تھا۔ پرانے زمانے کے شعرا کا قول ہے۔ کہ محبت کبھی نہیں مرتی۔ بلکہ یہ لافانی شہزادی ابد الآباد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن اگر محبت کا مجسمہ موت کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو بھی سکتا

ہے۔ تو ازبیلا انہیں ٹکڑوں پر بوسوں کی بارش کرتی رہی۔ اور ہولے ہولے آہیں بھرتی رہی۔ یہ محبت کا دیوتا تھا —— سرد مردہ۔ لیکن اب بھی اس کی حکومت دل پر تھی۔

وہ اسے پوشیدہ طور پر لے گئی اور یہ بیش بہا خزانہ ازبیلا کے لئے وقف ہو گیا۔ اس نے طلائی کنگھی سے اس کے ایستادہ بالوں کو سنوارا۔ آنکھوں کے سیاہ حلقوں کے اردگرد نوکیلی بھویں تیروں کی طرح تن کر کھڑی ہو گئیں۔ بہتے ہوئے دھارے کی طرح ٹھنڈے آنسوؤں سے اس نے کٹی ہوئی گردن پر چپٹے ہوئے گوشت کے بدنما لوتھڑوں کو صاف کر دیا۔ وہ ہر لمحہ ان بالوں میں کنگھی کرتی اور آہیں بھرتی —— وہ ہر لمحہ اس پر بوسوں کی بارش کرتی اور آنسو بہاتی۔

پھر اس نے اس سر کو ایک ریشمی رومال میں لپیٹ دیا۔ جو اہر لی کے خوشبودار پھولوں کے مشام نواز عطر میں بسایا گیا تھا۔ ازبیلا نے اس معطر خزانے کو ایک پیالے میں رکھدیا۔ اور اسے باغ کے ایک گوشے میں دفن کر دیا۔ اس میں اس نے ریحان کے نزہت بیز پھول لگائے۔ جو اس کے آنسوؤں سے ہمیشہ تر رہتے تھے۔

چاند سورج ستاروں کا خیال بھی اسکے ذہن سے مٹ گیا۔ ہرے درختوں کی جھومتی ہوئی ٹہنیوں پر جھکا ہوا نیلگوں آسمان اسکے دماغ سے محو ہو گیا۔ وہ پانی سے بھری ہوئی شفاف جھیلوں کو بھول گئی۔ اور موسم خزاں کی سرد ہواؤں کی تندی اور تیزی اس کے لئے بے معنی ہو گئی۔ لیکن ریحان کے خوشبودار پھول ہر وقت اسکی آنکھوں کے سامنے رہتے۔ وہ انہیں اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہتی۔

کئی دن گذر گئے اور وہ برابر اس نازک پودے کو اپنے نازک آنسوؤں سے سینچتی رہی۔ یہاں تک یہ پودا خوب بڑھ پھول کر تر و تازہ ہو گیا۔ یہ پھول اتنے خوبصورت اور خوشبودار تھے کہ فلارنس بھر میں ان کا مثل ملنا ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ پھول خراک حاصل کرتے تھے۔ انسانی خون سے اور ایک انسان کا فنا ہوتا ہوا سر کھاد کی طرح استعمال ہو رہا تھا۔ الغرض یہ قیمتی ہیرا عنبر بار پتیوں کی صورت میں پھوٹ پڑا۔

اے حزن کے دیوتا! چند لمحوں کے لئے ٹھہر جا موسیقی —— موسیقیٔ ملال کی آہیں بھر! اے آہ کی دیوی! اے حزن و ملال کے شیطانو! اپنے سر اٹھاؤ اور مسکراؤ۔ اپنے افسردہ سر اٹھاؤ اور اپنے خوفناک دھندلکے میں زرد روشنی کے دھبے بکھیر دو۔ تاکہ تمہارے افسردہ مزار نقرئی روشنی کے دہشت افزا دھبوں کے سایوں

ہیں آجائیں۔

اے افسردگی کی تانو! غمزدہ میلپامن کی گلے کی آہیں بنکر نکلو! بربخی ربط کے المیہ تاروں پر پتھراؤ اور اسکی موسیقی میں اسرار کی شراب بھر دو۔ کیونکہ سادہ دل ازبیلا جلد سے جلد موت کے گریہ جبڑوں میں جانے والی ہے۔ وہ ایک ایسے کھجور کی طرح مرجھا رہی ہے جس کو کسی ظالم نے اسکے خوشبودار شہد کے لئے کاٹ دیا ہو۔

آہ! چھوڑ دیجیئے۔ اس کھجور کو مرجھا کر سوکھ جانے کے لئے اور موت کے دکھیا سانسوں میں سردی کی منجمد کردینے والی تندی کو اس کے قریب نہ آنے دیجیئے! اس کے بھائیوں! دولت کے کتوں نے اسکی مردہ آنکھوں میں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے مسلسل تار کو دیکھ لیا۔ اسکے رشتہ داروں میں سے چند متجسس عفریت حیرت میں تھے۔ کہ حسن و جوانی کا ایسا مرکز ایک نواب کی ہونے والی بیوی کے ہاتھوں یوں مٹی میں مل رہا ہے۔

اسکے بھائیوں کو یہ حیرت تھی کہ وہ کیوں ریحان کے پودے کے قریب جھکی رہتی ہے۔ اور کیوں یہ پھول اس سرعت سے بڑھ رہے ہیں۔ کہ ان پر جادو کے پھولوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ عجیب و غریب باتیں ان کی سمجھ سے کوسوں دور تھیں انہیں کسی طرح بھی یقین نہیں آسکتا تھا۔ ریحان کا یہ حقیر جام ازبیلا کو اپنی حسین

جوانی اور مسرت سے چھلکتی ہوئی عمر بلکہ گذشتہ محبت تک کو بھلا دینے کی قوت رکھتا ہے اس لئے وہ اس راز کو طشت از بام کرنے پر تل گئے۔ وہ دیر تک کسی موزوں توجیہ کی بے سود جستجو کرتے رہے۔ کیونکہ ازبیلا ہر وقت پودے کے قریب بیٹھی رہتی تھی نہ ہی وہ گرجے میں جاتی اور نہ ہی بھوک و پیاس کی مجبوریاں اسے اس جام سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوتیں۔ اگر وہ کہیں جاتی تو اس پرند کی طرح جو اپنے انڈوں پر واپس آنے کے لئے بیقرار ہو فوراً واپس چلی آتی۔ وہ مرغی کے صبر و سکون کے ساتھ ریحان کے پھولوں کے قریب بیٹھی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برساتی رہی۔

لیکن اس حفاظت کے باوجود ان ظالموں نے جام ریحان چرا کر اسے کسی خفیہ مقام پر پہنچانے کا انتظام کر لیا۔ پیالے کے اندر رکھی ہوئی چیز گو کائی کی سبزی اور زرد دھبوں سے ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ تاہم ان کی نظریں تاڑ گئیں۔ کہ یہ لورنیزو کا سر ہے۔ انہیں قتل کا معاوضہ مل گیا۔ اس لئے وہ اسے ساتھ لیکر فلارنس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ ایک بے گناہ کے قتل کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھانے کے لئے فلارنس سے نکل گئے۔

اے حزن کے دیوتا! آنکھیں پھیر لے اس طرف سے۔ موسیقی! موسیقی! المیہ نغمے الاپ۔ افسردگی کے شیطانو! "الوداع" نہ گاؤ۔ کیونکہ ازبیلا حسین ازبیلا ایک

جوانی اور مسرت سے چھلکتی ہوئی عمر بلکہ گذشتہ محبت تک کو بھلا دینے کی قوت رکھتا ہے اس لئے وہ اس راز کو طشت از بام کرنے پر تل گئے۔ وہ دیر تک کسی موزوں تحفہ کی بے سود جستجو کرتے رہے۔ کیونکہ ازمیلا ہر وقت پودے کے قریب بیٹھی رہتی تھی نہ ہی وہ گرجے میں جاتی اور نہ ہی بھوک و پیاس کی مجبوریاں اسے اس جام سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوتیں۔ اگر وہ کہیں جاتی تو اس پرند کی طرح جو اپنے انڈوں پر واپس آنے کے لئے بیقرار ہو فوراً واپس چلی آتی۔ وہ مرغی کے صبر و سکون کے ساتھ ریحان کے پھولوں کے قریب بیٹھی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برساتی رہی۔

لیکن اس حفاظت کے باوجود ان ظالموں نے جام ریحان چرا کر اسے کسی خفیہ مقام پر لیجانے کا انتظام کر لیا۔ پیالے کے اندر رکھی ہوئی چیز گو کائی کی سبزی اور زرد دھبوں سے ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی۔ تاہم ان کی نظریں تاڑ گئیں۔ کہ یہ لورنیزو کا سر ہے۔ انہیں قتل کا معاوضہ مل گیا۔ اس لئے وہ اسے ساتھ لیکر فلارنس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ ایک بے گناہ کے قتل کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھانے کے لئے فلارنس سے نکل گئے۔

اے حزن کے دیوتا! آنکھیں پھیر لے اس طرف سے۔ موسیقی! موسیقی! المیہ نغمے الاپ۔ افسردگی کے شیطانو "الوداع" کہ گاؤ۔ کیونکہ ازمیلا حسین ازمیلا ایک

بڑی ہی غیر مکمل موت مرے گی۔ یہ ظالم اس سے جام ریحان بھی چھین کر لے گئے ہیں۔

وہ مردہ اور بے رُوح چیزوں کی طرف ترحم خیز نظروں سے دیکھتی اور اپنے گمشدہ جام ریحان کا پتہ پوچھتی وہ اپنی آواز کے الم انگیز تاروں پر گاتی اور آوارہ راہب سے پوچھتی۔ کہ اس کا جام ریحان کہاں ہے۔ اور وہ کیوں اس کی نظروں سے چھپا دیا گیا ہے؟ "یہ کس قدر ظلم ہے"۔ وہ کہتی۔ "میرا جام ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا"۔

وہ آخری دم تک جام ریحان مانگتی تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ فلارنس میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جس نے اس کی محبت کی پائمالی پر آنسو نہ بہائے ہوں۔ اس کی کہانی کی افسردہ پری لوگوں کی زبانوں پر سے اڑ کر سارے شہر پر چھا گئی۔ اب تک گاؤں میں یہ گیت سنا جاتا ہے۔ "آہ! یہ کتنا ظلم ہے۔ میرا جام ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا"۔